جرمِ ارتداد

اور

اس کی اسلامی سزا

جس میں اس نئے خیال کی تردید کی گئی ہے کہ
"مرتد اس دنیا میں مستوجبِ سزا نہیں ہے۔"

از

منظور احسن عبّاسی

سنہ ۱۹۷۴

قیمت ۵/-

ناشر

اسلامی مشن ○ سنت نگر ○ لاہور

من بدل دينه فاقتلوه

جُرمِ ارتداد

اور

اُس کی اِسلامی سزا

○

جس میں اس نئے خیال کی تردید کی گئی ہے کہ
"مرتد اس دنیا میں مستوجب سزا نہیں ہے"

○

از

منظور احسن عبّاسی

۱۹۷۴ء

www.KitaboSunnat.com

ناشر
اسلامی مشن سنت نگر لاہور

تعارف

از سراج الدین احمد پال

زیر نظر کتابچہ انگریزی میں شائع شدہ رسالہ موسومہ "اسلام میں سزائے ارتداد" پر ایک معقول تبصرہ ہے۔ رسالہ مذکور سپریم کورٹ آف پاکستان کے قابلِ احترام سابق قاضی القضاۃ جناب شیخ ایس اے رحمان کی تالیف ہے جس میں ملتِ اسلامیہ کے سوادِ اعظم سے اختلاف کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرتد کو قتل کی سزا دینا یا کوئی اور تعزیر اس پر لاگو کرنا نہ صرف نصِ قرآن بلکہ اصولاً آزادیٔ ضمیر کے خلاف ہے۔ وہ اس اجماعی فتوے کے قائل نہیں ہیں کہ ارتداد بجائے خود مرتد کو گردن زدنی قرار دیتا ہے جس کا نفاذ کسی اور عمل پر موقوف نہیں ہے۔

ہم یہاں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ پادری زویمر صاحب جن کا ذکر مؤلف رسالہ نے رسالہ میں کیا ہے، کو تو یہ شکایت ہے کہ اسلام نے جو سزائے قتل مقرر کر رکھی ہے وہ مسلمانوں کو فتنۂ ارتداد سے بچانے کے لیے ناقابلِ تسخیر سدِ سکندری کا کام دے رہی ہے اور ہمارے ممدوح مؤلف اسی دیوار کو مسمار کرنے کی فکر میں ہیں۔ پادری صاحب تو آزادیٔ ضمیر کی آڑ لے کر اپنے راستہ سے یہ سنگِ گراں ہٹانے کی فکر میں ہیں مگر ہمارے شیخ صاحب اس ناقابلِ تردید حقیقت کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں کہ انسان کی فطرت میں نفسِ امارہ بھی ودیعت کیا گیا ہے اور دنیا کا کوئی قابلِ ذکر ضابطۂ اخلاق ایسا نہیں جو انسانی اعمال پر مناسب احتساب اور حدود و قیود عائد نہ کرتا ہو۔ اسلام میں بھی بوجہ ارتداد زوجہ مسلمہ کا نکاح فسخ ہو جاتا ہے اور شرعاً مرتد کے حقوقِ وراثت زائل ہو جاتے ہیں اور یہ تعزیر حقوق العباد کے سلسلہ میں عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ مرتد جب دین و ملتِ اسلامیہ سے انحراف کرتا ہے تو اس دین اور ملت کی کسی خوبی اور تائید کے لیے ایسا نہیں کرتا اور نہ کر سکتا ہے۔ اس کا یہ فعل منافرت اور مخالفت کے سوا کسی اور سبب پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ اس نفرت، ناپسندیدگی اور برگشتگی کے باوجود تعجب ہے کہ ہمارے شیخ صاحب اس کو حربی تسلیم کرنے میں متامل ہیں۔

محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب جن کے تدین اور علم وفضل کے شیخ صاحب قائل ہیں، فرماتے ہیں کہ اسلام صرف دین ہی نہیں بلکہ قومیت بھی ہے اور جو دین کو چھوڑتا ہے وہ قومیت سے بھی الگ ہو جاتا ہے۔ شیخ صاحب کا موقف یہ ہے کہ کوئی مرتد مستوجب سزائے موت نہیں ہے جب تک کہ وہ دین وملت کے خلاف آمادہ حرب نہ ہو لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ حربی اور غیر حربی کی تقسیم دین وسیاست کی علیحدگی کے عقیدہ کی غمازی کرتی ہے۔ شیخ صاحب دینی ارتداد کو تو مستوجب تعزیر نہیں سمجھتے مگر سیاسی ارتداد کو قابلِ سزا وتعزیر ہونے کے قائل ہیں لیکن بقولِ اقبال :۔

ع۔ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس رسالہ میں بعض قرآنی آیات کو مفید مطلب بنانے کے لیے صرف شان نزول کے واقعات تک محدود رکھنے کی کوشش کی گئی ہے مگر دوسری جگہ یہ بھی مانا ہے کہ قرآنی احکام کے اطلاق کو شان نزول کے واقعہ تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ شاید اسی قسم کے متناقض استدلال کے باعث رسالہ کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔

یہ دعوےٰ غلط ہے کہ قرآن شریف سے کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے ظاہر ہو کہ مرتد کو دنیاوی سزا کا مستوجب بھی قرار دیا جا سکتا حالانکہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۷۵ سے ثابت ہوتا ہے کہ جرم ارتداد کی سنگینی اس قدر زیادہ ہے کہ خود حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر آپ کفار کے ورغلانے پر ذرا بھی ان کی طرف جھک جاتے تو دنیا میں بھی دگنا اور آخرت میں بھی دگنا عذاب دیا جاتا۔ پس جو مسلمان عملاً بھٹک کر ارتداد ہی اختیار کر لے اسے دنیا کے عذاب سے کس طرح محفوظ سمجھا جا سکتا ہے۔

ہمیں اپنے محترم بزرگ کی دینداری اور راسخ التعبدگی کا احترام ہے لیکن کوئی غیرت مند مسلمان یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کا عزیز یا دوست نجاتِ آخرت کے واحد ذریعہ اسلام سے برگشتہ ہو کر صداقت اسلام کے خلاف ایک زندہ اور چلتا پھرتا ثبوت بنکر معاشرہ میں دندناتا پھرے اور اس بدترین معصیت کی سخت ترین سزا کا مستوجب ہونے کے باوجود لطف ومدارات

کا مستحق ٹھہرے۔ ہم شیخ صاحب کو ان کی اس اجتہادی غلطی کے دور رس دینی اور سیاسی نتائج بد کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ وہ شخص جو دینِ اسلام سے پھر جاتا ہے یقیناً ملتِ اسلامیہ سے نفرت اور منافرت اس کو ارتداد پر آمادہ کرتی ہے اور خدا و رسول کے دینی اور اس کے پرستاروں سے بیزاری و ناموافقت سے زیادہ اعلانِ جنگ اور کیا ہو سکتا ہے۔ ارتداد سے امن کو تو کیا امداد ملے گی فساد کا بیج ضرور بویا جاتا ہے۔

سورۃ النحل کی آیت نمبر ۱ میں حکم ہوتا ہے کہ جو شخص ایمان لانے کے بعد بلا کسی اکراہ کے کافر ہو جائے اور جی کھول کر کفر کرے اس پر اللہ کا غضب ہوتا ہے اور اس کے لیے عذابِ عظیم ہے۔ کیا اس حکم سے اس استنباط کا جواز مل سکتا ہے کہ ایسا کافر دنیا میں غضبِ خدا سے محفوظ اور بری رکھا گیا ہے اور صرف آخرت میں عذاب میں مبتلا ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی فرمایا گیا ہے کہ غضب اور عذاب اس کے لیے اس لیے لکھا گیا ہے کہ اس نے آخرت پر دنیا کو ترجیح دی۔ یہ خیال یقیناً محلِ نظر ہے کہ اگر کوئی مسلمان مثلاً کسی دنیاوی لالچ کی بنا پر عیسائی ہو جائے تو اس کو اس کی آزادیِ ضمیر کے تحت نیک نیتی پر محمول کیا جائے گا اور اس کو تعزیر سے مستثنیٰ رکھا جائے گا۔

شیخ صاحب نے اسی طرح دیگر آیات کو بھی صحیح نقطۂ نظر سے ملاحظہ نہیں فرمایا۔ اور اس باب میں بظاہر زیرِ نظر کتابچہ کے مؤلف مولانا منظور احسن عباسی کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ شیخ صاحب نے قرآن شریف کو بہ نفسِ نفیس سمجھنے کی کوشش نہیں فرمائی۔

شیخ صاحب نے حضرت ابن عباس اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ جیسی جلیل القدر ہستیوں کی روایت کردہ احادیث کو اس بنا پر ناقابلِ اعتبار قرار دے دیا ہے کہ وہ نصِ قرآنی کے خلاف ہیں لیکن انہیں اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ کوئی نصِ قرآنی پیش کرتے۔ جس میں حکم دیا گیا ہو کہ مرتد کو قتل نہ کرو یا اس کے حربی بن جانے کا انتظار کرو۔ صحیح احادیث کے متعلق ایسی رائے رکھنے کی موجودگی میں شیخ صاحب نے اجماع کی قدر و قیمت کے متعلق جو خیالات ظاہر کیے

باسمہٖ تعالیٰ

مقدمہ

یہ مختصر رسالہ ملّتِ اسلامیہ کے اس اجماعی عقیدہ کی تائید میں ہے کہ:۔

"کسی مسلمان کا اسلام سے برگشتہ ہو جانا جسے اصطلاح میں "ارتداد" کہتے ہیں، اسلام کا سب سے بڑا جرم اور مستلزمِ سزائے موت ہے۔"

بہ ظاہر یہ فخر بھی اسلامی مملکتِ پاکستان ہی کو حاصل ہونا تھا کہ سرکاری طور پر اس عقیدے کے خلاف آواز بلند کرنے کی اجازت بلکہ اس کی اشاعت میں مالی امداد بھی دی گئی۔

اس عاجز کی نظر سے اسلام کی چودہ صد سالہ تاریخ میں کسی اسلامی مملکت کے کسی فرد کو یہ حوصلہ نہیں ہوا کہ اسلام کے اس معاشرتی، تمدّنی اور سیاسی روایت کے خلاف یہ کہنے کی جرأت کرتا کہ:

ارتداد جرم ہی نہیں سزا کیسی؟

جیسا کہ مسٹر غلام احمد پرویز نے کہا (قتلِ مرتد ص۳۷)

حال میں پاکستان کے سرکاری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ نے بھی اسی خیال کی تائید میں بزبانِ انگریزی ایک کتاب شائع کی ہے۔ زیرِ نظر رسالہ اس کے جواب میں ہے۔

کتابِ مذکور کے مؤلف سابق جسٹس جناب ایس۔اے رحمٰن ہیں جنہوں نے قرآن، حدیث، آثارِ خلفائے راشدین اور اقوالِ فقہاء کی تاویل سے یہ ثابت کرنے کی بڑی کوشش کی ہے کہ اسلام میں ارتداد کی کوئی دنیوی سزا نہیں ہے۔

اس عاجز کے خیال میں جناب جسٹس ممدوح کا راستہ مسٹر پرویز کے راستے سے بہت زیادہ دشوار تھا۔ ایک ایسا خیال جس کی تائید اسلامی ذخیرۂ علوم میں کہیں سے نہ ہوتی ہو اس کے لیے اسلامی مآخذ ہی سے دلائل گھڑنا بہت کٹھن کام تھا۔ مسٹر پرویز کے لیے تو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "من بدل دینہ فاقتلوہ" کو مُلّا[15] کا قول کہہ کر (قتل مرتد) اس کا مذاق اڑانا آسان تھا لیکن مؤلفِ کتاب نے اس کی تاویل میں بڑی زحمت اٹھائی۔

اگر یہ "تالیف کسی چکڑالوی، قادیانی یا پرویزی کی ہوتی تو اس قسم کے ہفوات کو نظر انداز کر دینا آسان تھا لیکن اس کتاب کے مصنف کی اہم شخصیت کے پیشِ نظر اس تلخ گھونٹ کو پی جانا کام و دہن پر ظلم کرنے کے علاوہ گناہ بھی تھا۔ ناچار اس عاجز نے اس کتاب پر تبصرہ ضروری سمجھا اور اس میں کوئی دشواری بھی پیش نہیں آئی کیوں کہ مؤلفِ کتاب نے اپنے دعاوی کی بنا جن امور پر رکھی ہے وہ امور خود ان کے خیال کی تردید کرتے ہیں۔ ان کا دعوٰی یہ ہے کہ "مرتد جب تک حربی نہ ہو جائے مستوجب قتل نہیں ہے" لیکن اس سوال کا جواب تمام کتاب میں نہیں ہے کہ کیا مرتد کے علاوہ کوئی حربی واجب القتل نہیں ہے۔ اگر ہر حربی واجب القتل ہے تو مرتد کی بیخ لگانے کے کیا معنے؟

بہرحال اس عاجز نے اس مسئلہ میں زیادہ چھان بین کی ضرورت نہیں سمجھی کیوں کہ کتاب و سنت وفقہ کے تمام ذخیرۂ علوم میں کہیں سے بھی جناب مؤلف کے خیال کی تائید نہیں ہوتی۔

زیرِ تنقید کتاب میں سب سے زیادہ افسوسناک وہ مقامات ہیں، جہاں کذب بیانی سے کام لیا گیا ہے لیکن اس کے بیشتر ذمہ دار غالباً مؤلف کے معاونین ہیں۔

بالآخر یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس رسالہ کی اشاعت جناب میاں فضل محمد صاحب کی مخلصانہ اور فیاضانہ عنایت اور جناب محترم خواجہ صلاح الدین صاحب اور جناب سید اختر احسن صاحب کنوینر ادارہ اسلامی مشن کی بذل توجہات کی ممنونِ منت ہے۔

نیاز مند کے اس رسالہ میں سہو، خطا اور فروگذاشتوں کا امکان ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ نہج استدلال میں بھی خامیاں ہوں لیکن اس دعویٰ میں کسی شائبہ غلطی کا امکان نہیں ہے کہ:

"جرمِ ارتداد مستلزمِ سزائے قتل ہے۔"

منظور احسن عباسی
(سکرٹری دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری)
۱۱۲۔ ڈی ماڈل ٹاؤن لاہور
یکم جنوری ۱۹۷۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف و تمہید

حال میں سرکاری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور سے ایک کتاب انگریزی زبان میں Punishment of apostasy in Islam (اسلام میں سزائے ارتداد) کے نام سے شائع ہوئی جس میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی مملکت میں کسی مسلمان کا اسلام سے پھر جانا امرِ مستوجب سزا نہیں ہے۔

تحقیقِ مسئلہ

اس کے فاضل مصنف جناب جسٹس ایس اے رحمٰن نے اس مسئلہ کی تحقیق میں کوئی ۱۰۰ کتابوں سے اخذِ مطالب فرمایا ہے جس میں ۲۰ کتبِ تفاسیر، ۸ کتبِ احادیث ۳ کتبِ فقہ اور ۴۲ متفرق کتب تواریخ وغیرہ ہیں۔ لیکن یہ امر انتہائی حیرت انگیز ہے کہ ان کتابوں کے مؤلفین میں سے شاید دو کے علاوہ کسی ایک مفسر، محدث، فقیہ یا مؤرخ کو فاضل مصنف ممدوح سے اتفاق نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے ارتداد کو اسلام کا سب سے بڑا جرم اور اس کے مرتکب کو واجب القتل قرار دیا ہے۔ اب ان دونوں اصحاب کے نام بھی سن لیجئے جو اس باب میں مؤلف ممدوح کے ہم آہنگ ہیں یا پھر مؤلف کو ان کا ہم آہنگ تصور فرمایا جا سکتا ہے۔ ایک صاحب کا نام مسٹر غلام احمد پرویز ہے دوسرے مرزا غلام احمد قادیانی کے مشن کے علمبردار مولانا محمد علی لاہوری ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ مؤلف ممدوح نہ پرویزی ہیں اور نہ مرزائی لیکن طرزِ استدلال بالکل وہی ہے جو مسٹر پرویز کا ہے یعنی قرآن سے جو احکام جملہ متقدمین و متاخرین نے اخذ فرمائے یا خلفائے راشدین نے جس پر عمل کیا اور یا فقہائے امت نے جو مسائل مرتب فرمائے ان کے قطعاً متضاد نتائج جو مسٹر مذکور نے اخذ فرمائے زیرِ تبصرہ کتاب اسی کی صدائے بازگشت ہے۔ گویا مؤلف ممدوح نے مرتد کے باب میں جو فیصلہ فرمایا ہے وہ عین اس

فیصلہ کے مطابق ہے جو پرویز صاحب نے اپنی کتاب "قتلِ مرتد غلام اور لونڈیاں" میں صادر فرمایا ہے۔

کتاب سزائے مرتد اور اسلام کے حدودِ اربعہ

زیرِ نظر کتاب کو مؤلف نے پیش لفظ اور تمہید کے علاوہ حسبِ ذیل چار ابواب پر تقسیم فرمایا ہے:

۱۔ ارتداد اور قرآن ۲۔ ارتداد اور سنت

۳۔ ارتداد اور خلافتِ راشدہ ۴۔ ارتداد اور فقہاء

۵۔ خلاصہ اور نتیجہ

پیش لفظ میں کم و بیش ڈیڑھ درجن اصحاب کا شکریہ ادا کیا گیا ہے جنہوں نے حوالہ جات کی جستجو میں مؤلف کی مدد فرمائی اور یا مواد کی فراہمی میں اعانت کی۔ ان میں سے بعض ایسے اصحاب ہیں جن سے میرا ذاتی تعارف ہے وہ سب کتاب کے مضمون سے بیزار ہیں۔ دو ایک کے سوا شاید کوئی ایک شخص بھی دینی علوم کا فارغ التحصیل نہیں ہے گو وکیل، جج، پی۔ ایچ۔ ڈی اور اعلیٰ تعلیم کے ماہر ہیں۔ اس کتاب کے باب میں ان کی رائے کا مجھے علم نہیں لیکن اس امر کا یقین ہے کہ اس کتاب کی جملہ خامیوں کے ذمہ دار یہی مشیرانِ بے توفیق ہیں۔

کتاب کی تمہید سے مؤلف کی نیک نیتی کا احساس ضرور ہوتا ہے لیکن نیک نیتی کے ساتھ سلیقہ کاری کی اشد ضرورت ہے ورنہ خواہ کتنے ہی اعلیٰ مقاصد پیشِ نظر ہوں غلط راستوں کو اختیار کرنے کا نتیجہ زیاں کاری و تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اسلام کا بھونڈا خاکہ

تمہید سے مترشح ہوتا ہے کہ مؤلف ممدوح ملّتِ اسلامیہ کے دامن سے ان تمام داغوں کو مٹا دینا چاہتے ہیں جو اغیار کی نگاہوں میں کھٹکتے ہیں۔ شاید انہوں نے اس کتاب

میں ایک مسیحی مبلغ کے طعنوں سے جھنجھلا کر اس کتاب کی تالیف کا ارادہ کیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"بعض مغربی غیر مسلم مصنفین نے اسلام کی جو تصویر پیش کی ہے وہ مجھ جیسے قرآن کے ایک معمولی طالب علم کی نگاہوں میں اسلام کی فیاضانہ اور روادارانہ انسانی تعلیمات کے خلاف نہایت بھونڈا خاکہ معلوم ہوتی ہے چنانچہ جناب ماجد خدوری ارتداد کے متعلقہ قوانین کی اقدار کا موازنہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ فقہاء اور علمائے دین سب اس امر پر متفق ہیں کہ ایک مسلمان کا اسلام سے پھر جانا اسلامی قانون کی ایک ایسی خلاف ورزی ہے جس کی سزا اسے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بھگتنی پڑے گی۔ صرف یہی نہیں کہ آخرت میں ایسے شخص کی نجات نہ ہوگی بلکہ وہ اسلامی مملکت میں سب سے بڑی سزا (موت) کا مستوجب ہے۔" (ص۴)

مؤلفِ کتاب بھی شاید فقہا اور علمائے دین کی اس بھونڈی تصویر کو خانۂ قلب میں سجا لیتے لیکن مشکل یہ ہوئی کہ مصر کے ایک مسیحی مبلغ کے طعنے کو وہ برداشت نہ کر سکے چنانچہ انہوں نے دیباچۂ کتاب میں انکشاف فرمایا ہے کہ :۔

مصر کے مسیحی مشنری کا طعنہ

"مصر کے مسیحی مشنری سیمول زویمر Samuel M. Zwemer نے بتایا ہے کہ مسلمانوں میں سے معدودے چند ہی اشخاص ہیں جنہیں عیسائی بنایا جا سکا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کے سر پر ترکِ اسلام کی صورت میں سزائے موت کی تلوار لٹکتی رہتی ہے۔ اس مشنری نے مصر میں مسیحی تبلیغی مشن کے سربراہ ڈاکٹر انڈریو واٹسن کی کتاب موسومہ "مصر میں امریکہ کی مسیحی سرگرمیاں" میں بتایا ہے کہ ۱۸۵۴ء سے ۱۸۹۶ء یعنی چالیس

سال کے عرصہ میں) ۵۰ مسلمان جن کو عیسائی بنایا گیا وہ سب کے سب قتل کر دیے گئے۔ کیونکہ اسلامی قانون میں خواہ وہ مذہبی ہوں یا ملکی شخصی آزادی ——— آزادیِ ضمیر ——— کی کوئی گنجائش نہیں"

فقہا و علمائے اسلام کی تحریف

مؤلفِ کتاب کو اسلام کے اس قانون پر جس کی رو سے مسیحی مبلغین کو اپنے عزائم مشومہ میں مسلسل ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور جس کی برکت سے آج تک خالص اسلامی حکومتیں شرک و کفر کی غلاظتوں کے تعفن سے خالی ہیں سخت اعتراض ہے وہ تمام فقہاء و علمائے اسلام کو قرآن حکیم کی واضح تصریحات میں تحریف کا مرتکب قرار دیتے ہیں اور جرم ارتداد کو مستوجب سزائے موت قرار دیا جانا ملتِ اسلامیہ کے لیے باعثِ شرم، خلافِ انسانیت اور اسلام کے خلاف تصور فرماتے ہیں۔

قرآن کے دو تحریف کرنے والے

انہوں نے قرآن حکیم کی اس کھلی تحریف کرنے والوں اور اس خلافِ انسانیت قانون کے علمبرداروں میں سے صرف دو اصحاب کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک جناب ڈاکٹر حمید اللہ Muslim conduct of state کے مصنف ہیں جن کو خود مؤلف نے اسلامی علوم کا جید عالم قرار دیا ہے اور دوسرے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی ہیں جن کا تعارف انہوں نے عہدِ حاضر کا عالمِ دین اور ایک سیاسی پارٹی کے سربراہ کی حیثیت سے کرایا ہے ڈاکٹر حمید اللہ کی بابت لکھا ہے کہ:۔

"ان کے نزدیک مسلمان کا اسلام سے برگشتہ ہو جانا دینی اور سیاسی غداری ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اور عمل، حضرت ابو بکر رضؓ کے فیصلے اور ان پر عملدرآمد، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ صحابہ اور بعد کے تمام فقہائے اسلام نیز آیات قرآن حکیم کی دلالۃ النصوص اس امر

پر متفق ہیں کہ مرتد سب سے بڑی سزا (موت) کا مستوجب ہے۔" (ص۴۔۵)

اسی طرح مولانا مودودی کی کتاب "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" سے ایک طویل اقتباس نقل فرمایا ہے جس میں پاکستان کے اسلامی ملک بن جانے کے بعد اس قانون کے نفاذ کی عملی شکل بیان فرمائی گئی ہے۔

مؤلفِ کتاب کا موقف یہ ہے کہ تمام ملتِ اسلامیہ اس باب میں تیرہ سو سال سے غلطی میں مبتلا ہے اور مسلسل قرآنی تحریف کی مرتکب ہو رہی ہے یا قرآن کو صحیح نہیں سمجھ سکی کیونکہ متذکرہ بالا ہر دو اصحاب کے باب میں مؤلف کی رائے یہ ہے کہ یہ خیالات ان لوگوں کو گوارا نہیں ہو سکتے جو اسلام کو ہر ظرف وحال کے لیے ایک ابدی اور زندہ دستورِ حیات تصور کرتے ہیں۔ ان کو سب سے بڑا اندیشہ یہ ہے کہ مغرب کے عناد پسند عناصر ایسے خیالات کو اپنے اغراضِ مشؤمہ کے لیے آلۂ کار بنائیں گے" ص۹

غالباً اس کتاب کی وجۂ تالیف یہی ہے۔

علامہ اقبال کی حوصلہ افزائی

فاضل مؤلف نے بتایا ہے کہ "ان کو (سیزدہ صد سالہ اسلامی فراست کے خلاف) اس اقدام کا حوصلہ علامہ اقبال کے خطبہ ششم کے مطالعہ سے ہوا جس میں انہوں نے عہدِ حاضر کی جدید نسل کو اجازت دی ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی قوانین کی تعبیر عہدِ حاضر کی روشنی میں کریں" لیکن تعجب ہے کہ علامہ ممدوح کے اس اجازت نامہ کی ایک شرط کو انہوں نے نظر انداز فرمایا۔ علامہ موصوف نے اپنے اسی خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ "ہر نسل جدید کو اجازت ہے کہ وہ اپنے مسائل کا حل قرآن سے تلاش کرے بشرطیکہ اسلاف کی روایات میں تحریف کیے بغیر ان سے رہنمائی حاصل کی جائے"

یہ امر انتہائی افسوسناک ہے کہ اس تمام کتاب میں جناب مؤلف نے اس شرط کو نظر انداز فرما کر اسلاف کے متفقہ فیصلہ اور سیزدہ صد سالہ روایات میں سے کسی کو بھی

اپنے خنجر تحریف سے محفوظ نہیں رکھا اور روایاتِ اسلاف کے بالکل برعکس فیصلہ صادر فرمایا ہے۔ اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو ملتِ اسلامیہ نے بالاجماع و بالاتفاق بقولِ مؤلف قرآن کے صریحی حکم کی خلاف ورزی کی یا پھر مؤلف موصوف خود ہی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

اس رسالہ کی وجہ تالیف

دیباچۂ کتاب کے اختتام پر انہوں نے فرمایا ہے کہ جن خیالات کا اظہار اس کتاب میں کیا گیا ہے اسے حرفِ آخر کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ یعنی ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ یہ ارشاد راقم الحروف کے لیے حوصلہ افزائی کا موجب ہوا اور یہ تحریر اسی کا نتیجہ ہے اور اب بے دھڑک یہ کہنا ممکن ہے کہ جناب ممدوح نے اس کتاب کی تالیف میں نہایت بے پروائی سے کام لیا ہے۔ بیشتر دلائل غیر منطقی ہیں اور بعض صریح کذب بیانی پر مبنی ہیں۔

ایک احمقانہ نظریہ

میرے خیال میں ان کی سب سے بڑی فروگذاشت یہ ہے کہ انہوں نے ایک احمق مسیحی مشنری ڈاکٹر واٹسن کے اس قول پر یقین فرمایا کہ جرم ارتداد کو سزائے موت کا مستوجب قرار دینا freedome of conscience کے منافی ہے۔ چنانچہ مؤلفِ کتاب نے اسلامی تعزیرات میں سے اس دفعہ کو نکال دینے یا اس کے وجود سے انکار کر دینے کا عزم فرمایا لیکن انہوں نے اس احمقانہ نظریہ پر اس نقطۂ نظر سے غور فرمانے کی زحمت نہیں کی کہ آیا آزادیِ ضمیر پر کوئی قدغن لگائی بھی جا سکتی ہے یا نہیں ؟ حقیقت یہ ہے کہ ایک اسلام کا تعزیری قانون کیا دنیا بھر کی تعزیرات کی تلواریں کسی کے سر پر لٹکا دی جائیں تب بھی اس کی ضمیر کی آواز اس کے قلب میں گونجتی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قانونِ الٰہی کے مفتشین نے جہاں ہر مرتد کو واجب القتل کہا ہے وہاں ایسے مرتد کو جو جبراً مسلمان بنایا گیا ہو مرتد ہو جانے پر واجب القتل نہیں گردانا۔ (مستثنیٰ) کیونکہ سر پہ جبر کی

ٹپکتی ہوئی تلوار کے زیرِ اثر مسلمان ہونے والے کو مسلمان ہی تصور نہیں کیا گیا تو اس کا مرتد ہونا بے معنی ہے۔ قرآن حکیم کی وسیع المفہوم اور حکمتِ محض پر مبنی آیت لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے معنوی پہلوؤں میں سے ایک اہم پہلو یہی ہے۔ یہ آیت کسی شخص کو جبراً دین میں لانے سے مانع اس لیے ہے کہ جبر سے دین کو بدلا ہی نہیں جا سکتا لہٰذا جبر و اکراہ دین کے باب میں لاحاصل ہے اور ہر امرِ لاحاصل دینِ اسلام میں ممنوع ہے۔ اگر کوئی ایسا تصور بھی کرتا ہے کہ دین میں جبر کو دخل ہے وہ خود اپنی فراست کا مذاق اڑاتا ہے۔ بغرض جبر و اختیار کا تعلق آزادیٔ ضمیر سے نہیں بلکہ آزادیٔ ضمیر کے نتائج یا عملی اقدامات سے ہے۔

آزادیٔ ضمیر کو چھینا نہیں جا سکتا

آزادیٔ ضمیر، حریتِ فکر یا فریڈم آف کونشنس ہر فعل خیر و شر کی بنیاد ہے۔ ایک اسلام کیا دنیا کا کوئی قانون آزادیٔ ضمیر کو پابہ زنجیر نہیں کر سکتا لیکن کسی معاشرہ میں بھی انسان کو من مانی کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ڈاکٹر واٹسن سے بھی زیادہ عہدِ حاضر کے ایک اور احمق نے قرآنِ حکیم کے اس ارشاد سے کہ "جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے" یہ سمجھا کہ یہ آزادیٔ ضمیر کا درس ہے اور ہر شخص کو یہ آزادی حاصل ہے کہ جو دین چاہے اختیار کرے۔ حالانکہ اس آیت کا مدعا ایک فطری حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو آزادیٔ مشیت عطا فرمائی ہے۔ اسی کا نام آزادیٔ ضمیر ہے کہ اس پر نہ کوئی پابندی ہے نہ لگائی جا سکتی ہے البتہ اعمالِ کفر و ایمان پر سزا و جزا کا انحصار ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ قانون کی دسترس عقائد پر نہیں ہے اعمال پر ہے۔ لہٰذا آزادیٔ ضمیر کا تمام درس لغو اور بے نتیجہ ہے۔ دراصل آزادیٔ افکار کا نعرہ لگانے والے آزادیٔ عمل کے طلبگار ہیں کہ وہ جو چاہیں کریں اس پر کوئی قدغن نہ ہو۔ ان کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم جو چاہیں سوچیں اس پر کوئی پابندی نہ ہو کیونکہ یہ تحصیلِ حاصل ہے۔

آزادیٔ فکر کا دوسرا نام وسوسہ شیطان: قرآن کے نزدیک آزادیٔ فکر کا نام

وسوسۂ شیطان ہے جس سے خدا کی پناہ مانگنے کا حکم ہے اور اسی کی بابت اقبال نے فرمایا ہے کہ
"آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد"

آزادیٔ ضمیر و آزادیٔ عمل

مقام حیرت ہے کہ مؤلف کتاب جو علامہ اقبال کے بہت بڑے مداح ہیں علامہ کے علی الرغم آخر اس شیطانی ایجاد کی اتنی شد و مد سے کیوں حمایت فرما رہے ہیں یہاں تک کہ اس کتاب میں آزادیٔ ضمیر ہی کو ملت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ اگر آزادیٔ ضمیر کے مطالبہ سے غرض آزادیٔ عمل ہے تو بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کسی شخص کو من مانی کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور راہِ راست کے اختیار کرنے پر نہ صرف یہ کہ آمادہ کرتا ہے بلکہ مجبور بھی کرتا ہے یہاں تک کہ اس باب میں دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام کو سب سے بڑا جابر کہا جا سکتا ہے کیونکہ اسلامی نظام میں حیاتِ انسانی کے ہر عمل کی حدود متعین ہیں اور ان سے تجاوز جرم ہے اور جرم کی نوعیت کے مطابق سزا کا تعین کیا گیا ہے لیکن اسلام کا یہ ایک ایسا جرم ہے جس سے عالم انسانیت کا کوئی خطہ محفوظ نہیں ہے۔ قانون کی بنا ہی جبر نفس پر ہے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اگر نفوس انسانی کو آزادیٔ عمل (یا لاقانونیت) کی فضا میں چھوڑ دیا جائے تو تمام دنیا انسانوں کی بجائے درندہ جانوروں کا مسکن ہو کر رہ جائے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر آزادیٔ ضمیر یا آزادیٔ عمل کے پرستار کیا چاہتے ہیں؟

حسن ظن سے کام لیتے ہوئے اگر آزادیٔ ضمیر کے مطالبہ کا مقصد یہ سمجھا جائے کہ ہر شخص کو یہ حق ہونا چاہیئے کہ دوسرے ابنائے نوع کو ضرر پہنچائے بغیر جو چاہے سوچے اور جو چاہے کرے تو اس قسم کی آزادیٔ ضمیر و آزادیٔ عمل نہ صرف یہ کہ اسلام کا نصب العین ہے بلکہ اس باب میں دنیا کا کوئی مذہب یا کوئی معاشرہ اسلام سے بہتر ضابطہ حیات پیش نہیں کر سکا۔

ڈاکٹر واٹسن کی شرارت

ڈاکٹر واٹسن کا یہ کہنا کہ اسلامی قانون میں شخصی آزادی یا آزادیٔ ضمیر کی کوئی گنجائش

نہیں، بہت بڑی شرارت ہے۔ کیونکہ دنیا کے کسی قانون میں بھی آزادیٔ ضمیر یا شخصی آزادی کی گنجائش نہیں ہے۔

فاضل مؤلفِ کتاب کو چاہیئے تھا کہ وہ اس کتاب کو لکھنے سے پہلے دنیا بھر کی حکومتوں کے قانونوں میں سے کسی ایک ملک میں بھی شخصی آزادی یا آزادیٔ ضمیر کا سراغ لگاتے۔ کیا کوئی قانون بھی دنیا میں ایسا ہے جس میں جبرِ نفس نہ ہو اور افرادِ معاشرہ کو اس قانون پر عمل کرنے کے لیے مجبور نہ کیا گیا ہو۔ غرض تا وقتیکہ شخصی آزادی یا آزادیٔ ضمیر کی حدود متعین نہ کی جائیں یہ اصطلاحیں مہمل ہیں اور اس مہمل مطالبہ پر اصرار حماقت نہیں تو اور کیا ہے

اسلام سے معصومانہ برگشتگی

فاضل مؤلف تعزیرِ مرتد کے قانون میں بھی آزادیٔ ضمیر کی ایک حد متعین فرماتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ "آیا اسلام سے ایک معصومانہ برگشتگی بھی جس میں کوئی سیاسی گٹھ جوڑ نہ ہو قابلِ تعزیر ہے؟" (ص) اس سوال میں لاشعوری طور پر وہی قانونی نکتہ ان کے پیشِ نظر ہے کہ کوئی قانون ضمیر کی آزادی کو نہیں چھین سکتا لیکن ایک قانون بھی ایسا نہیں جو آزادیٔ عمل پر جبر نہ ہو۔ اس بارے میں انسان کی فطرت اور اسلام کا قانون ہم آہنگ ہیں یعنی قانونِ اسلامی کی رو سے کوئی شخص بڑے سے بڑا گناہ سوچ سکتا ہے لیکن چھوٹے سے چھوٹے جرم کی پاداش سے نہیں بچ سکتا۔ آنحضرتؐ کے ایک ارشاد کا مفہوم یہی ہے۔

قانون اور آزادیٔ ضمیر

ہاں قانون کی افادیت پر نکتہ چینی کی جا سکتی ہے لیکن کسی قانون کو خواہ کتنا ہی سخت ہو آزادیٔ ضمیر کے خلاف کہنا ہر لحاظ سے غلط ہے کیا کسی فوج سے برگشتہ سپاہی کو گولی مار دینا یا پارلیمانی حلیف کا آئینِ ملکی سے انحراف کی پاداش میں سزا پانا آزادیٔ ضمیر کے خلاف ہے — ؟ اگر نہیں تو مرتد کا مستوجب سزائے موت ہونا کیوں آزادیٔ ضمیر کے منافی ہے؟

جرائم کی سزا آزادیٔ ضمیر کے منافی نہیں:

جناب جسٹس رحمٰن کو تو نہیں کیوں کہ وہ

مسلمان ہیں البتہ ڈاکٹر واٹسن کو یہ اختیار ہے کہ وہ اسلامی سزائے مرتد کے قانون کو عیسائی مذہب کے لیے نقصان دہ اور اپنے تبلیغی مقاصد کی راہ میں پتھر سمجھیں لیکن نہ یہ آزادئ ضمیر کے منافی ہے اور نہ صحیح معنوں میں آزادی کے خلاف ہے بالکل اسی طرح جیسے قتل، زنا، شراب، سرقہ و قذف کے مرتکبوں کو سزائے تازیانہ، رجم یا قطع ید وغیرہ کا مستوجب قرار دینا آزادئ ضمیر و شخصی آزادی کے منافی نہیں ہے۔ پھر ہر حکومت کے قوانین ان کی ملّی سیاسی و معاشرتی صوابدید کی بنیاد پر بنائے جاتے ہیں۔ پاکستان میں بلدیاتی قانون یہ ہے کہ شاہراہوں پر بائیں طرف سے گاڑیاں چلائی جائیں لیکن امریکہ میں دائیں جانب سے چلانے کا حکم ہے۔ اب اگر شخصی آزادی یا آزادئ ضمیر کا خبطی امریکی قانون کے خلاف پاکستان کے قانون کو شخصی آزادی یا آزادئ ضمیر کے خلاف تصور کرے تو لوگ اسے احمق ہی کہیں گے، اسی طرح لادینی نظام کے خلاف کسی بھی اسلامی قانون کو شخصی آزادی کے منافی سمجھنا بھی حماقت ہے کیونکہ شخصی آزادی یا آزادئ ضمیر کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ انسان دوسروں کو آزار پہنچائے بغیر اپنے ہر فکر و عمل میں آزاد ہو۔ مطلق اور بے عنان آزادئ فکر و عمل بلا شبہ بقولِ اقبال شیطانی ایجاد ہے یہی وجہ ہے کہ اس کو کسی بھی آئینی حکومت میں پنپنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر اشتراکی ملکوں میں جہاں آزادئ ضمیر کا ڈنکا بج رہا ہے کوئی اشتراکی اپنے اصول سے برگشتگی کا اعلان کر کے زندہ نہیں رہ سکتا اور کوئی غیرت مند اشتراکی اس کی مذمت نہیں کرتا تو آخر ایک اسلامی مملکت میں اسلام سے برگشتہ ہونے والے کو مستوجب تعزیر قرار دیے جانے پر کسی مسیحی کی مذمت ایک مسلمان کی غیرت کو کیوں نہیں جھنجھوڑتی۔

مرتد کی دو قسمیں

ہمارے فاضل چیف جسٹس مؤلف کتاب کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر اسلام سے برگشتہ ہونے والا (یا مرتد) مسلمانوں سے برسرِ پیکار یا حربی نہ ہو تو وہ مستوجب قتل نہیں ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے مرتد کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک مرتدِ حربی اور دوسرا مرتدِ امن پسند۔ اوّل الذکر کو

وہ بھی واجب القتل قرار دیتے ہیں لیکن یہ امر انتہائی حیرت کا موجب ہے کہ اس کتاب میں ایک بھی امن پسند یا بے ضرر مرتد کی نشاندہی نہیں کی گئی جس کو معاف کر دیا گیا ہو اور اسے ایک امن پسند مرتد کی حیثیت سے زندہ رہنے کا حق تسلیم کیا گیا ہو۔ اس کے برعکس انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ ابتدائی عہد میں جتنے بھی مرتد تھے وہ سب دشمن کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے برسرِ پیکار تھے۔" (ص۱۳۳، ص۱۳۴) قطع نظر اس کے کہ یہ بیان سراسر خلافِ واقعہ ہے حقیقت یہ ہے کہ جن مرتدین کو بھی قتل کیا گیا ان میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہوا ہو۔ ایسے مرتدوں کو قتل کا حکم ہی نہ تھا بلکہ ان سے قتال کا حکم تھا کیوں کہ وہ محارب جماعت میں شامل ہونے کے باعث واجب القتل نہیں بلکہ واجب القتال تھے اور بدوران حرب قتل ہوئے۔ یہ قتل تعزیری نہیں بلکہ دفاع میں کیا گیا۔ اس کے برعکس محارب مرتد نہ ہو تب بھی قتل کیا جا سکتا ہے بلکہ وہ مسلمان بھی جو کفار کے ساتھ شامل ہو کر مسلمانوں سے لڑے قتل کیا جائے گا۔ لہٰذا مؤلفِ کتاب کا یہ دعوے بھی قطعاً غیر منطقی ہے کہ وہی مرتد واجب القتل ہے جو حربی ہو جائے۔ مؤلف جیسے فاضل انسان نے کتاب کے متعدد مقامات پر اس موقف کو دہرایا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حربی مرتد نہ ہو تو واجب القتل نہ ہو گا حربی تو مسلمان ہو کر کافروں سے مل جائے اور مسلمانوں سے لڑے تو اسے بھی قتل کیا جائیگا مجھے جناب جسٹس رحمٰن سے ہرگز یہ امید نہ تھی کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں ایسے غیر منطقی دلائل کا سہارا پکڑیں گے۔

مرتد حربی کو واجب القتل قرار دینے کی بجائے اگر وہ یہ ارشاد فرماتے کہ مرتد، حربی ہو جانے کے بعد، واجب القتل نہیں رہتا تو یہ خیال شاید زیادہ قوی ہوتا کیونکہ حربی کا قتل ضروری نہیں بلکہ سیاسی تقاضوں کے مطابق اس کو قید میں رکھا جا سکتا ہے اور غلام بنایا جا سکتا ہے لیکن مرتد غیر حربی بہر حال واجب القتل ہوتا ہے گویا محض مرتد ہونا اس کے واجب القتل ہونے کا سبب قوی ہے بہ نسبت حربی ہو جانے کے۔ لیکن اسلام کے اس واضح نظریہ کے

خلاف مؤلفِ کتاب کے نزدیک محض ارتداد کی کوئی سزا نہیں تاوقتیکہ وہ حربی نہ ہو جائے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ نہ تو آزادیٔ ضمیر کا غیر واضح اور بے معنی تصور مرتد کو قتل سے بچا سکتا ہے اور نہ اس کی محض خیالی امن پسندی اسے زندہ رہنے کا حق دیتی ہے۔

مرتدِ حربی اور مرتد امن پسند

جرمِ ارتداد کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھا جائے تو اس امر میں کوئی شک نہیں رہتا کہ بقولِ ڈاکٹر حمید اللہ "کسی مسلمان کا اسلام سے برگشتہ ہو جانا دینی اور سیاسی غداری ہے" اور غدار کبھی امن پسند نہیں ہو سکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مؤلفِ کتاب بھی اسلام کی سیزدہ صد سالہ تاریخ میں کسی ایک امن پسند مرتد کی نشاندہی نہیں فرما سکے جسے معاف کر دیا گیا ہو اور اس طرح انہوں نے تسلیم کر لیا کہ ہر مرتد غدار ہے۔ پھر یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ارتداد ایک ایسا فعل ہے جو بدترین اخلاقی جرائم سے زیادہ معاشرہ کے امن میں خلل اندازی کا باعث بنتا ہے۔ ارتداد کو اگر جرم ناقابلِ تعزیر قرار دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے مسلم آباء واجداد کی دولت سے محروم کیا جائے۔ ادھر مرتد کی بیوی اگرچہ ایک بیوہ حیثیت کی خاتون رہ جاتی ہے اور اسکے بچے یتیم ہو جاتے ہیں لیکن خاوند اور باپ کے ورثہ سے بیوی بچے محروم رہتے ہیں کیونکہ وہ زندہ ہے۔ مرتد کی زندگی بجائے خود حقانیتِ اسلام کے خلاف ایک چلتی پھرتی شہادت ہے۔ مرتد اپنے ماں باپ کی مسلسل ذہنی کوفت کا باعث ہوتا ہے اور اسلامی عقاید کی توہین کا موجب بنتا ہے۔ مذہب اسلام سے انحراف ڈاکٹر وائسن کے طعنوں سے کہیں زیادہ اسلام پر ضربِ کاری کا موجب ہے۔ اسلامی معاشرہ میں ایک مسلمان کا ایمان ہزاروں مسلمانوں کی جانوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ مسلمان اپنی جانیں قربان کر دیں گے لیکن ایک مسلمان کے ایمان کو کسی قیمت پر فروخت کرنا گوارا نہ کریں گے کیونکہ ایک مسلمان کے ترکِ اسلام سے ملتِ اسلامیہ کو وہ نقصان پہنچتا ہے جو سینکڑوں مسلمانوں کی جانوں کے اتلاف سے نہیں پہنچتا۔ مرتد کا ہر لمحۂ زیست اسلام کے لیے موجبِ ذلت و

رسوائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے متعدد اہلِ بصیرت مرتد کو فوراً قتل کر دینے کے حامی ہیں اور اس امر پر تو سب متفق ہیں کہ اس کو (توبہ کی) مہلت دینا کوئی امرِ مستوجبِ ثواب نہیں ہے۔ بعض اصحاب نے جو مرتد کو توبہ کرنے کی مہلت دی ہے اس میں ملتِ اسلامیہ ہی کی کوئی بہتری پیشِ نظر تھی۔ لیکن جنہیں مہلت دی جاتی ہے ان کو آزاد شہری کی طرح معاشرہ میں خلا ملا کی ممانعت ہے۔ انہیں بہت بڑے مجرم کی حیثیت سے قید میں رکھا جاتا ہے غرض مجرمِ ارتداد امن پسند ہونا بھی چاہے تو نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص کا اسلام سے پھر جانا ناگزیر طور پر سارے معاشرہ کی بے چینی کا باعث بن جاتا ہے۔ شاید مؤلفِ کتاب امن پسند مرتدین کی نظیر میں عہد حاضر کے برگشتگانِ دین کو پیش فرمائیں لیکن انہیں اس سے اختلاف نہ ہوگا کہ مغرب میں بھی کوئی مسلمان اگر ترکِ اسلام کرتا ہے تو مشرق کے مسلمانوں کے سینوں پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اخوتِ اسلامی کے جذبات سے عاری ہونے کے باعث دینی نقصان کی یہ حس کمزور پڑ گئی ہو۔ خود ہمارے ملک میں بھی اگر بدقسمتی سے کوئی مسلمان عیسائی بن جائے تو اس مرتد کے کنبہ کے لوگوں، دوستوں اور رشتہ داروں بلکہ بستی والوں کے سینے یہ سانحہ تلخیٔ مرگ سے کم نہیں ہوتا اسکا اگر کوئی علاج ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ ایسے موذی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس کی زندگی جتنی طویل ہوتی جاتی ہے اہلِ تعلق کی کوفت اتنی ہی زیادہ ہوتی جاتی ہے کیونکہ نہ مسلمان اولاد زیادہ عرصہ تک کافر ماں باپ کا ننگ گوارا کر سکتی ہے اور نہ مسلمان والدین اپنی کافر اولاد کا وجود پسند کرتے ہیں جناب مؤلف کو اختیار ہے کہ وہ مرتد کے حق میں جو مراعات چاہیں تجویز فرمائیں۔

جرمِ ارتداد پیغمبرِ اسلامؐ کے نزدیک

پیغمبرِ اسلامؐ کے نزدیک تو یہ جرمِ ارتداد، قتلِ عمد اور زنائے محصن کے جرم سے کسی طرح کم نہیں اور اسی لیے حضورؐ نے اس کے لیے سزائے موت تجویز فرمائی ہے

مرتد اور کافرِ اصلی کا فرق: جناب مؤلف کا یہ نظریہ بھی ناقابلِ فہم ہے کہ اسلامی معاشرہ

میں مرتد اور کافر اصلی دونوں کی حیثیت یکساں تصور کی جائے۔ ہر فردِ مسلم ملت کا ایک سپاہی اسلام کا محافظ، احکام الٰہیہ کا پابند اور خدا و رسول کا معتمد ہوتا ہے لیکن کوئی غیر مسلم نہ ان امور کا مدعی ہوتا ہے اور نہ اس سے توقع کی جاسکتی ہے۔ نہ وہ اپنے کسی قول و قرار سے پھرتا ہے۔ اس کے برعکس ایک مسلمان اسلام سے برگشتہ ہو کر دین معاشرہ اور ملتِ اسلامیہ کی غداری کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس کی زندگی ہی اسلام کے خلاف نفرت و حقارت کا اعلان ہے اس کے متعلق امن پسندی اور عافیت کوشی کا تصور ہی خطرناک قسم کی خوش فہمی ہے۔ معہذا ایک مرتد ان تمام خرابیوں کا مرکز ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ کوئی دانش مند ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ کسی صورت بھی کافر و مرتد کی ایک سی ہی حیثیت قرار دی جائے۔ چنانچہ "تاریخ اسلام کے اوراق گواہ ہیں کہ اسلامی مملکت میں بے شمار غیر مسلم اپنے تمام شہری حقوق میں مسلمانوں کے برابر کے شریک رہے لیکن ایک فردِ مرتد کی موجودگی کا سراغ نہیں ملتا۔ اس وقت بھی ایسے متعدد اسلامی ممالک ہیں جہاں گو اسلامی قانون نافذ نہیں ہے لیکن کسی ایک مرتد کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی اگرچہ غیر مسلم لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ غرض پاکستان کو اگر ایک اسلامی ملک کی حیثیت سے ابھرنا ہے تو اس میں کسی مسلمان کو اسلام سے برگشتہ ہونے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پاکستان کو کفر و الحاد کے سیلاب سے بچانا کسی صورت ممکن نہ ہوگا۔ میں نہایت ادب کے ساتھ فاضل مؤلفِ کتاب سے درخواست کروں گا کہ وہ پاکستان پر رحم فرما کر اس قسم کے خیالات کے اظہار سے مجتنب رہیں اور یقین فرمائیں کہ:

۱۔ آزادیٔ ضمیر کا مطالبہ لاقانونیت اور طوائف الملوکی کی دعوت ہے اور یقیناً بالفاظِ اقبال شیطان کی ایجاد ہے۔ قتلِ مرتد کا اسلامی قانون اسی طرح جبرِ نفس پر مبنی ہے جس طرح دنیا کے تمام قوانین ہیں۔

۲۔ جرمِ ارتداد بجائے خود امن کا دشمن اور فتنہ و فساد کی جڑ ہے اور اس کی اجازت

کفر و الحاد کے سیلاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ امن پسند مرتد کی اصطلاح لغو ہے۔ دنیا میں ایک مرتد بھی ایسا نہیں جس نے ملّتِ اسلامیہ کو اضطراب میں ڈالا ہو۔

۳۔ غیر مسلم اور مرتد دونوں کو ایک پلڑے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ ہزاروں کافر و مشرک ملّتِ اسلامیہ کے لیے اتنے نقصان دہ نہیں جتنا ایک مسلمان جو دین سے برگشتہ ہو جائے۔ لہٰذا اس کا وجود جتنی جلد مٹانا ممکن ہو اتنا ہی بہتر ہو گا۔

کیا قتلِ مرتد کا حکم اسلام کے خلاف ہے؟

اب ہم اس کتاب کے اس نہایت افسوسناک حصہ پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قتلِ مرتد کا حکم اسلام کے خلاف ہے۔

آیت لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ

اس مقصد کے لیے محترم مؤلفِ کتاب نے جو دلائل پیش فرمائے ہیں ان سب کی بنیاد قرآن کی آیت لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ ہے جس کے لفظی معنے ہیں کہ دین میں کوئی جبر نہیں اور لکھا ہے کہ قرآن نے اس غیر مبہم عبارت میں اسلام کے بنیادی عقیدے کو بیان فرمایا ہے اور اسلامی نظامِ حکومت کے لیے ایک واضح اصول مقرر کر دیا ہے کہ There is no compulsion in religion اور بتایا ہے کہ اس کی تائید قرآن کی بکثرت آیات سے ہوتی ہے جن سے عیاں ہے کہ اسلام صراطِ مستقیم سے پھر جانے کو ناپسند تو کرتا ہے لیکن واضح طور پر اسے برداشت کرنے کا حکم دیتا ہے۔ (ص ۱۳۰)

مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ مؤلفِ کتاب نے اس آیت سے مطالب کے اخذ کرنے میں ٹھوکر کھائی ہے اور یہ میں اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ قرآن حکیم کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں مفسروں میں سے کوئی بھی اس باب میں ان کا ہم خیال نہیں ہے۔ نہ اس آیت میں کسی بنیادی عقیدہ کا ذکر ہے نہ کسی اصول کا۔ نہ صراطِ مستقیم سے ہٹنے کا اور نہ اسے ناپسند کرنے کے باوجود برداشت کرنے کا۔ بلکہ صرف ایک حقیقت نفس الامری کا بیان ہے کہ مذہب

میں جبر کو دخل نہیں ہے۔ یہ محض ایک اختیاری یا توفیقی امر ہے۔ اگرچہ یہ ایک جملہ خبریہ ہے انشائیہ نہیں ہے تاہم اس سے یہ مفہوم بدلالت النص (نہ کہ بہ صراحۃ النص) نکلتا ہے کہ جبراً کسی کو اپنے دین میں لانا بے فائدہ ہے۔ لہٰذا اس سے پرہیز کرنا چاہیئے لیکن یہ ناقابلِ فہم اور حیران کن ہے کہ راہِ راست سے ہٹ جانا ہر چند کہ قرآن کے نزدیک ایک امر ناپسندیدہ ہے لیکن اس پہ کوئی قدغن نہ ہونی چاہیئے بلکہ اسے برداشت کرنا چاہیئے۔ مسلمان دینِ اسلام سے پھرتے رہیں اور ملت تماشائی بنی دیکھتی رہے۔ اس آیت کا یہ عجیب و غریب مفہوم نہ کسی آیت سے مستنبط ہوتا ہے نہ کسی حدیث سے نہ ان الفاظِ آیات سے اور نہ آج تک کسی نے یہ مفہوم نکالا اور نہ نکل سکتا ہے۔

اِکراہ کا مفہوم

پہلی بات تو یہ ہے کہ جملہ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ خبر ہے انشا نہیں ہے۔ یعنی یہ ایک حقیقت کا بیان ہے حکم نہیں ہے لیکن اس سے حکم کا استنباط بدلائل النص کیا جا سکتا ہے اصل معنے یہ ہیں کہ دین کے باب میں جبر سے کام نہیں لیا جا سکتا یا کسی کو جبراً کسی دین کے اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ مفہوم بالواسطہ indirectly یہ نکالا جا سکتا ہے کہ مسلمان بنانے کے لیے جبر نہ کرو کیوں کہ جبراً مسلمان بنایا بھی جائے تو وہ مسلمان نہ ہوگا پس اس فعلِ عبث سے کیا فائدہ؟

دوسری بات یہ ہے کہ لفظِ اکراہ کے معنے از روئے لغت ناپسندیدہ امر پر اکسانے یا مجبور کرنے کے ہیں (مصباح اللغات) اور یہی وہ حرکت ہے جو قابلِ تعزیر و مذمت ہے اور جس کا صرف اسلام ہی سخت دشمن نہیں ہے بلکہ ہر مہذب جمعیت میں یہ فعل جرم ہے یہاں پر میرا روئے سخن پھر جناب جسٹس رحمٰن صاحب کی جانب ہے جن کی تمام عمر قانونی موشگافیوں اور حق و باطل کے امتیاز میں گزری ہے۔ انھوں نے معلوم نہیں کتنے ہی جابرانہ اقدامات کے خلاف سزائیں دی ہوں گی کیا کبھی پسندیدہ امر پہ اکسانے والے یا

اکراہ فی الحق کو مستوجب سزا قرار دیا ہے ۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اکراہ قابلِ مذمت یا قابلِ تعزیر وہ ہے جو حق کے لیے نہ ہو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اسی لیے فرمایا ہے کہ "دین کے باب میں جبر بھی ہو تو اسلامی قانون میں وہ جبر نہیں ہے"۔ نواب صدیق حسن خان نے بھی آیت بالا کے تحت اسی خیال کا اظہار فرمایا ہے ۔[19] اور یہی وجہ ہے کہ تعزیراتِ پاکستان میں بھی کسی سزا کو جبر نہیں کہا جا سکتا ۔ قانون جبراً ناپسندیدہ امور سے روکتا ہے تاہم وہ جبر نہیں ہے ۔

اسی کے قریب قریب ایک تیسرا تصور یہ ہے کہ الدین سے مراد اسلامی ضابطۂ حیات ہے اور اس ضابطۂ حیات کو نافذ کرنے میں جبر بھی کیا جائے تو وہ جبر یا اکراہ میں داخل نہیں ہے اور یہ وہی اصول ہے جو دنیا بھر کی تمام آئینی حکومتوں میں نافذ ہے ۔ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے ان معنوں کی تائید میں تمام مفسرینِ متقدمین و متاخرین کو پیش کیا جا سکتا ہے لیکن جناب مؤلف نے جو مفہوم پیش فرمایا ہے کہ "اسلام صراطِ مستقیم سے ہٹ جانے کو ناپسند تو کرتا ہے لیکن اسے برداشت کر لینے کا حکم دیتا ہے" یہ مطلب کسی نے بیان نہیں کیا ۔ اگر لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے صحیح مفہوم کو جناب مؤلف کے خود ساختہ مفہوم سے الگ کر کے دیکھا جائے تو اس کتاب کا تمام مضمون باطل ہو کر رہ جاتا ہے ۔ انہوں نے بڑے شد و مد سے قتلِ مرتد کے قانون کو اس آیت کے منافی قرار دیا ہے اور کئی صفحات میں مفسرین کے اس قول کو بار بار دہرایا ہے کہ یہ آیت دین کے بارے میں جبر کے منافی ہے لیکن اس کو قتلِ مرتد کے قانون سے کوئی نسبت نہیں ۔ اس آیت میں دین کے باب میں جبر کی ممانعت ہے ۔ اور قتلِ مرتد کے قانون میں دین سے برگشتہ ہونے کی سزا بتائی گئی ہے ۔ دین سے برگشتہ ہونا یعنی ارتداد اور دین پر مجبور کرنا یعنی اکراہ دو مختلف عمل ہیں ۔ لہٰذا یہ آیت مرتد پر منطبق ہی نہیں ہوتی کیوں کہ دونوں کی نوعیت مختلف ہے ۔ اس خیال کا اظہار مؤلفِ کتاب نے بھی کیا ہے ۔ چنانچہ لکھا ہے کہ :-

"کہا جاتا ہے کہ اگرچہ کسی شخص کو اس کی مرضی کے خلاف مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تاہم اگر کوئی شخص رضا کارانہ طور پر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جائے تو پھر اسے دائرہ اسلام سے باہر جانے کی اجازت نہ ہو گی بلکہ اسے اسلامی عقیدہ پر قائم رہنے کے لیے مجبور کیا جائے گا۔ اگر مرتد ہو جائے تو اسے جبراً دوبارہ مسلمان بنایا جائے گا لہذا یہ آیت مرتد پر منطبق نہیں ہوتی۔ پھر بتایا ہے کہ اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا ہے (یہ نہیں بتایا کہ وہ کونسا دانش مند ہے جس نے یہ جواب دیا) کہ اگر تارکِ دین کو پہلے ہی سے یہ بتا دیا جائے کہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد جیتے جی اس سے نکلنے کی اجازت نہ ہو گی تو اس آیت کا اطلاق اس پر ہو گا اور عدم مطابقت کا دعوے باطل ہو جائے گا (یعنے ایسے شخص کو مجبور نہ کیا جائے گا کہ وہ اسلام پر قائم رہے) کیا اس لغو جواب کا یہ مطلب ہے کہ اگر کوئی پیدائشی مسلمان مرتد ہو جائے تو اس پر یہ آیت منطبق نہ ہو گی (اور اسے مجبور بھی کیا جائے گا اور مستوجب قتل بھی ہو گا کیونکہ اسے پہلے نہیں بتایا گیا تھا کہ مسلمان ہونے کے بعد وہ پھر نہیں سکتا)"

بظاہر مؤلفِ کتاب خود بھی اس احمقانہ گفتگو سے مطمئن نہیں ہیں۔ اس لیے جھنجلا کر فرماتے ہیں کہ "میرے نزدیک تو یہ آیت اس قسم کی موشگافیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔" (صفحہ ۲۵) دیکھا آپ نے کافر اور مرتد کے نمایاں فرق کو جس پر کافر کے زندہ رہنے اور مرتد کے مارے جانے کے مسئلہ کا انحصار تھا، مؤلفِ کتاب نے کس طرح نظر انداز کر دیا ہے۔

سزائے ارتداد کا موجب

ظاہر ہے کہ اسلام کسی دین کے ترک کر لینے یا کسی دین کے اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرتا اسلامی نظامِ حکومت میں ہر مذہب و ملت کے اشخاص کو زندہ رہنے، اپنی تہذیب و ثقافت

کے تحفظ اور جملہ حقوقِ انسانیت کے مطالبہ کا حق ہے اور ان کے جان ومال وآبرو کی حفاظت حکومتِ اسلامیہ کا فرض ہے۔ غیر مسلم اشخاص کے دینی امور میں کسی قسم کا جبر تو کیا شائبہ مداخلت بھی نہیں ہے۔ لیکن ارتداد، حق شکنی اور غداری کے معاملہ میں حکومت کو یہ حق ہے کہ وہ عہد شکنی اور حکومت سے غداری کرنے والوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم لہذا مرتد کی سزا ئے قتل کافر ہونے کے جرم کی پاداش میں ہرگز نہیں ہے کیونکہ اگر کافر ہونا جرم ہوتا تو اسلامی مملکت میں کسی غیر مسلم کا نام ونشان نہ ہوتا۔ بلکہ مرتد سزائے موت کا مستوجب نقضِ عہد کی پاداش میں ہوتا ہے۔ چنانچہ مؤلف نے خود ارتداد کے معنے وعدہ خلافی بتلائے ہیں۔ (ص۹) ارتداد ایک ایسا سنگین نقضِ عہد ہے جس سے مرتد کے متعلقین ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ سارا معاشرہ اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کا نقضِ عہد کوئی غیر مرتد (کافر ہو یا مسلم) کرے تو وہ بھی مستوجبِ قتل ہے۔ اس سے عیاں ہے کہ اس قانون کو لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے خلاف قرار دینا سخت غلطی ہے۔

مؤلفِ کتاب نے خدا معلوم کس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر قتلِ مرتد کے قانون کو قرآن کے اس حکم کے خلاف قرار دیا یہاں تک کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد، خلفائے راشدینؓ کے عمل، تمام فقہاء کے استنباطات اور تمام مسائل متعلقہ کی تاویل کر ڈالی۔

مرتد کی سزائے موت قرآن سے ثابت ہے

سب سے زیادہ جس قول نے انہیں غلطی میں ڈالا، علامہ سرائی کا یہ ارشاد ہے کہ:

"مرتد کی سزائے موت قرآن سے ثابت نہیں بلکہ احادیث سے ثابت ہے" (ص۱۰)

مؤلفِ کتاب موصوف نے سرائی کے اس قول کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اس بارے میں خود علامہ سرائی کے فیصلہ سے انکار کر دیا ہے جنہوں نے وضاحت کے ساتھ مرتد کو واجب القتل قرار دیا ہے اور اس کے دلائل پیش کیے ہیں۔ علامہ سرائی کی خوش قسمتی دیکھئے کہ قرآن میں قتل مرتد کا حکم نہ پا کر بھی وہ قتل مرتد کے فیصلہ پر ایمان لائے ہیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنی کتاب

قتلِ مرتد" کے دیباچہ میں یہ بتایا ہے کہ انہوں نے یہ کتاب اسی لیے لکھی ہے کہ قتلِ مرتد کا شرعی حکم ثابت کیا جائے لیکن مؤلف کتاب سرائی کی طرف اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن میں قتلِ مرتد کا حکم نہیں۔ لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ علامہ سرائی آخر کس طرح اس کو اسلامی قانون تصور کرتے ہیں۔ غضب یہ ہوا کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے ایک مسیحی پرفیسر ہیفننگ (Heffening) نے بھی (لفظ مرتد کے تحت) یہی لکھ دیا کہ قرآن میں قتلِ مرتد کا ذکر نہیں ہے اس کے بعد تو یہ خیال پتھر کی لکیر بن گیا۔ یہاں تک کہ مؤلف کتاب کے نزدیک ایک جید عالم محمد حمید اللہ نے جو یہ لکھا ہے کہ سورہ مائدہ کی آیت ۵۵ اور سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۸ میں مرتد کی یہی سزا بتائی گئی ہے۔ اس کے متعلق مؤلف کا ارشاد ہے کہ ان کے لیے اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ ان آیات سے قتلِ مرتد کی سزا کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن یہ بیان نہیں فرمایا کہ آخر اس کے تسلیم کرنے میں کیا دشواری ہے اور ہیفننگ کی بات کس طرح صحیح ہے۔ مولانا مودودی نے سورۂ توبہ کی آیات ۱۱، ۱۲ سے مرتد کی یہی سزا اخذ فرمائی ہے لیکن اس کو مؤلف نے اس لیے رد کر دیا ہے کہ مستند مفسرین نے آیت کی تفسیر کو قتلِ مرتد سے وابستہ نہیں کیا لیکن سوال یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس آیت سے قتلِ مرتد کا مفہوم نہیں نکالا آخر وہ بھی جناب مؤلف کی طرح ارتداد کو ناقابلِ تعزیر جرم کیوں نہیں خیال فرماتے

کافرِ اصلی اور مرتد کے جرائم میں فرق

مؤلفِ کتاب نے اپنی کتاب کے باب ارتداد اور قرآن کے تحت کم و بیش بیس صفحات پر قرآن حکیم کی ۴۷ آیات کی شرح و تفسیر مختلف مفسرین کی کتابوں سے نقل فرمائی ہے۔ جو کفار و مشرکین اور ان کے عذابِ آخرت کے متعلق ہیں۔ ان تمام آیات میں کفر و شرک کے مجرموں کو عذابِ آخرت کا مستوجب قرار دیا گیا ہے۔ بعض آیات میں ان سے تعرض نہ کرنے کا، بعض سورتوں میں لڑنے کا اور بعض میں انہیں پناہ دینے کا حکم ہے اور بعض میں یہ ذکر ہے کہ پیغمبر صرف پیغامِ الٰہی پہنچا دینے کا ذمہ دار ہے اور انہیں میں آیت لا اکراہ

فی الدّین ہے جس میں اشارہ ہے کہ ان پر مسلمان ہونے کے لیے جبر نہ کیا جائے اور اس تطویل لاطائل کے بعد ایک طویل وعظ ہے کہ عقاید کفریہ پر اس دنیا میں کوئی سزا نہیں۔ اسلام بردباری اور شخصی آزادی کی فضا میں پھل پھول سکتا ہے اور یہ کہ قرآن خوشگوار اور شاندار زندگی کی رہنمائی کرتا ہے لیکن انسانیت پر جبر کر کے نہیں بلکہ ہر شخص کو پوری آزادی ہے کہ وہ خیر و شر میں جسے چاہے اختیار کرے وغیرہ۔ بظاہر اس زحمت کے برداشت کرنے کی غرض یہ ہے کہ مرتد کی سزائے موت کے خلاف زمین تیار کی جائے لیکن مؤلف کتاب کو یہ معلوم نہیں کہ اسلام کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی شاید یہ حقیقت اُن سے زیادہ جانتا ہے کہ اسلام انسانیت، حسنِ اخلاق، مروت، رواداری اور عالمگیر انسانیت کے حقوق کا کس قدر پاسبان ہے اور جبر و ستم اور پامالیٔ حقوقِ انسانیت سے کس درجہ بیزار ہے۔ اسلام نے انسانی حقوق کے تحفظ کی خاطر ہی دنیا میں بے انصافی، حق تلفی، ایذا رسانی، رہزنی، قتل بدکاری و بداخلاقی اور معاشرہ کے امن و عافیت کو برباد کرنے والی ہر حرکت پر سختی کے ساتھ قدغن عائد فرمائی تاکہ بنی نوع انسان کی آزاد اور بے خطر زندگی میں کسی قسم کا خدشہ نہ لاحق ہو۔ کیا جناب مؤلف جو قانون کے لعل جلیل ہیں بتا سکتے ہیں کہ تعزیراتِ ملکی کا یہ عظیم الشان دفتر بے معنی ہے اور جبر و ستم کا راستہ کھولنے کے لیے ہے یا امن و عافیت کا ضامن ہے۔ کیا سنگساری، سزائے موت، ہاتھ پاؤں کاٹنے، دُرّے لگانے وغیرہ حدود و تعزیرات کے قرآنی ابواب کو وہ جبر و ستم کہہ سکتے ہیں۔ ان کے اور دوسرے تمام ملت کے دانشوروں میں آخر یہ اختلاف کیسے پیدا ہوا کہ اسلام جن امور کو امن و عافیتِ عامہ کے برپا کرنے کی تدبیر قرار دیتا ہے وہ اسی کو امن و عافیت کے خلاف اقدامات تصور فرماتے ہیں۔ ان تمام ۲۲ آیات اور اسی طرح کی سو سے زیادہ آیات کے ترجمہ و تفسیر میں اس کے سوا اور کیا ہے کہ بنی نوع انسان کو اعمالِ کفریہ و افعالِ مشرکانہ سے نفرت دلائی جائے اور کفار و مشرکین کو اپنے کرتوتوں کے دردناک انجام سے آگاہ کیا جائے۔

آخر ان الفاظ میں ان پر رأفت و مہربانی کے پھول برسانے اور لطف و کرم کا ذکر کہاں ہے البتہ ان کے جبر و ستم پر صبر کرنے کی تلقین ضرور ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بدکردار کو اس کے کیفرِ کردار سے قبل از وقت آگاہ کر دینا بڑی حکمت اور عین عنایت کی بات ہے لیکن مؤلفِ کتاب نے اس طولِ کلام سے یہ کس طرح ثابت کیا کہ دین سے برگشتہ ہونے والے کی کوئی سزا نہیں ہے۔

اگر سوال کرنے والا پوچھے کہ ایک مسلمان کا اپنے دین سے برگشتہ ہو جانا جرمِ واجب التعزیر ہے یا نہیں اور جواب دینے والا کہے کہ خدا کا انکار کرنے والا واجب التعزیر نہیں تو یہ جواب، سوال از آسمان و جواب از ریسمان کی کہاوت کا مصداق ہوگا۔ جرمِ ارتداد معاشرہ میں فتنہ، اضطراب، توہینِ ملت، ذہنی کوفت اور دوسری معاشرتی خرابیوں اور غداری پر مبنی ہے جس کی سزا موت کے علاوہ نہیں۔ لیکن کافر کا معاملہ براہِ راست خدا سے ہے یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ فردِ تعزیرات میں جرمِ کفر کا ذکر نہیں ہے۔ جرمِ ارتداد کی تفصیل ہے۔ کفر کی دنیا میں کوئی سزا نہیں لیکن جرمِ ارتداد کی سزا مذکور ہے۔ یہاں پر ایک بار پھر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ مرتد کو سزائے موت اس کے جرمِ ارتداد کی پاداش میں دی جاتی ہے، جرمِ کفر کی سزا بلاشبہ اسے عاقبت میں بھگتنا ہے اور اس کا ثبوت قرآنی آیات سے ملتا ہے کہ مرتد کو عذابِ دنیا و آخرت کا سامنا کرنا ہوگا۔ کیونکہ اس کے جرم کی دو نوعیتیں ہیں برخلاف کافر کے جس کے جرم کی نوعیت ایک ہے۔

ان آیات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ دنیا میں چونکہ کافر کی کوئی سزا نہیں ہے اس لیے مرتد کی بھی کوئی سزا نہیں ہے۔ لیکن یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مرتد کی سزائے موت کفر کی پاداش میں نہیں دی جاتی بلکہ اسلام سے برگشتہ ہو جانے کی پاداش میں ہے۔ اسلامی قانون کفر سے درگزر کرتا ہے لیکن ارتداد ناقابلِ معافی جرم ہے۔

مرتد اور قاتل کی سزائے قتل یکساں قرآن سے ثابت ہے: بلاشبہ قرآن حکیم میں مرتد

کی سزائے موت کا بالتصریح ذکر نہیں ہے۔ لیکن جملہ احکاماتِ قرآنی صراحۃ النص پر موقوف نہیں ہیں۔ آیاتِ کلامِ الٰہی سے جو احکام ثابت ہوئے ہیں وہ بیشتر دلالۃ النص یا اشارۃ النص یا اقتضاء النص سے ثابت ہیں لیکن ان کا وجوب ویسا ہی ہے جیسے کہ صراحۃ النص سے ثابت ہونے والے احکام کا۔ حتیٰ کہ قاتل کی سزائے قتل بھی قرآن حکیم کی صراحۃ النص سے ثابت نہیں ہے۔ قتل ناحق کا ذکر قرآن حکیم میں صرف ایک مقام پر ہے:۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (نساء : ۹۳)

یعنی اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو دانستہ قتل کر دے تو اس کی پاداش جہنم ہے جس میں ہمیشہ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب اور پھٹکار ہے اور اس کے لیے عذاب عظیم تیار ہے۔

ارتداد کے باب میں بھی اسی طرح کی آیات آئی ہیں مثلاً:۔

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

یعنی تم (مسلمانوں) میں سے اگر کوئی اپنے دین سے برگشتہ ہو جائے، اور (دوبارہ اسلام نہ لائے بلکہ) کافر ہی مرجائے تو ایسے لوگوں کا کیا دھرا دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں برباد ہے۔ اور ان کی پاداش جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔ (بقرہ : ۲۱۷)

کیا اس آیت میں سزائے قتل کا کوئی ذکر ہے ؟ پھر کیا سزائے قتل قرآن کے خلاف ہے لیکن چونکہ اس آیت سے اشارۃً اور دوسری آیت سے دلالۃً قتل کا بدلہ قتل ثابت ہے اس لیے یہ حکم بھی اسی طرح واجب العمل جس طرح صراحت النص کی صورت میں ہوتا۔ وہ آیت جو حکم قتل پر دلالت کرتی ہے، یہ ہے:۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ الآية (مائدہ:)

یعنی ہم نے (تورات میں اہل کتاب پر) یہ فرض کیا ہے کہ جان کے بدلے جان لی جائے اور آنکھ کے بدلے آنکھ وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ نہ قرآن میں یہ حکم ہے اور نہ مسلمانوں سے خطاب ہے اور نہ یہ آیت انشا ہے کہ اس سے حکم مستنبط ہو تاہم اس کا مفہوم ہی دلالت کرتا ہے کہ اللہ کا حکم ہے۔ لہذا بہ اقتضائے نصیح بھی قرآنی حکم ہو۔

اسلام سے ذرا سا ہٹنا بھی مستوجب سزائے دنیا و آخرت ہے:

سورہ بنی اسرائیل رکوع ۸ میں ایک طویل آیت ہے جس کا مفہوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوشیار رہنے کے حکم پر مشتمل ہے اور یہ جتایا گیا ہے کہ کفار آپ کو بہکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر ارشاد ہے:۔

وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ۝ إِذًا لَّأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا یعنی اے پیغمبر! اگر اللہ تعالیٰ تمہیں ثابت قدم نہ رکھتا اور تمہارا ذرا سا میلان بھی ان کافروں کی طرف ہو جاتا تو ہم تم کو دوہری سزا دیتے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

یہ آیت بالتصریح بتاتی ہے کہ ایک حق پرست ذرا سا بھی کفر کی طرف مائل ہونے کی پاداش میں دنیا اور آخرت دونوں جگہ مستوجب سزا ہے۔ کیا اس سے یہ امر بالکل واضح نہیں ہو جاتا کہ مؤلف کتاب کا یہ خیال کہ ارتداد کی کوئی سزا اس دنیا میں نہیں۔ اگر سراسر واہمہ نہیں تو اور کیا ہے۔

علامہ ابن حیان الاندلسی نے آیت سابقۃ الذکر کی تفسیر میں مرتد کے لیے حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ جو آیا ہے۔ اس کے تحت درج فرمایا ہے کہ حبط اعمال

فی الدنیا سے مراد یہ ہے کہ مرتد مستوجبِ قتل ہے۔ یہ معنے انہوں نے بطور دلالۃ النص اخذ فرمائے ہیں۔

ڈاکٹر واٹسن جو چاہیں کہیں لیکن علامہ مسراتی کا یہ فرمانا کہ قرآن میں مرتد کے لیے قتل کا حکم نہیں ہے۔ اس کا مقصد سوا اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ قتلِ مرتد کا حکم قرآن کی صراحۃ النص سے ثابت نہیں۔ لیکن ان کا بھی ایمان یہی ہے کہ اگر مرتد توبہ نہ کرے تو واجب القتل ہے اور اسی حال میں مر جائے تو بہر حال مستوجبِ عذابِ جہنم ہے اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا ارشاد بھی یہی ہے کہ قتلِ مرتد کے باب میں قرآن میں صراحۃ النص نہیں ہے لیکن دلالۃ النص سے ثابت ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے مؤلف سورہ بقرہ کی آیت متذکرہ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ الآیۃ کی تفسیر میں بہت دور کی کوڑی لائے ہیں جو آج تک شاید کسی مفسر کو ہاتھ نہیں آئی ہے کہ آیت میں لفظِ فَيَمُتْ معنی خیز ہے۔ اس سے مراد natural death (طبعی موت) ہے اور آیت سے مرتد کا طبعی موت مرنا صاف عیاں ہے (ص ۳۲) گویا مرتد غیر طبعی موت مر ہی نہیں سکتا۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ جناب مؤلف نے اپنی قانونی زندگی میں کسی مجرم قاتل، مستوجبِ قتل کو دار پر لٹکائے جانے سے پہلے ہی طبعی موت مرتے نہ دیکھا ہو۔ اگر قاتل پھانسی پانے سے پہلے طبعی موت مر سکتا ہے تو مرتد بھی قتل ہونے سے پہلے کیوں نہیں مر سکتا۔ اگر اس آیت میں اس لفظ کو قدرتی موت کے معنوں میں مخصوص کر دیا جائے تو اس آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ جو مرتد حالتِ ارتداد میں قدرتی موت مر جائے وہ مستوجبِ عذاب ہوگا۔ یعنی اگر اس کی موت قدرتی نہ ہو یعنی حادثاتی موت یا قتل ہو تو اس پر عذاب نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ قرآنی آیت اس مضحکہ خیز معنی آفرینی سے بالاتر ہے۔ آیت کا مطلب اس کے سوا نہیں کہ اگر مرتد حالتِ ارتداد میں مر جائے تو وہ بہر حال عذابِ جہنم کا مستحق ہے خواہ اس کی موت طبعی ہو یا حادثاتی یا تعزیری۔ اس آیت کے اشارۃ النص سے

یہ واضح ہوتا ہے کہ مرتد خواہ کسی قسم کی موت سے دوچار ہو، عذاب الٰہی کا بہرحال مستحق ہے یعنی اس کی تعزیری موت بھی اس کو عذاب سے نہیں بچا سکتی۔ اگرچہ زانی محصن کی تعزیری موت اس کو عذاب سے بچا لیتی ہے۔ غرض جرم ارتداد کی شدت اس آیت کے اشارۃ النص سے بھی ثابت ہوتی ہے۔

مؤلف کتاب نے اس آیت کی تشریح میں متعدد مفسرین کے اقوال نقل فرمائے ہیں لیکن ان میں سے ایک قول بھی سزائے قتل مرتد کے خلاف نہیں بلکہ سب اس امر پر متفق ہیں کہ مرتد واجب القتل ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ اس طول کلام سے مؤلف کو کیا حاصل ہوا؟

سورۂ آل عمران سے استدلال

اس کے بعد سورۂ آل عمران کی چند آیات کا ترجمہ درج ہے جن کا خلاصہ مفہوم یہ ہے کہ "جو شخص ایمان لانے کے بعد اس سے برگشتہ ہو جائے وہ ہدایتِ الٰہی سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں پر خدا، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔ ان کا مستقبل تاریک ہے انہیں کبھی معاف نہ کیا جائے گا۔ ہاں اگر توبہ کر لیں تو خدا بڑا غفور رحیم ہے۔ لیکن جن کا طریق کار ہی یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد برگشتہ ہو جاتے ہیں اور کفر میں بڑھتے چلے جاتے ہیں ان کی توبہ قبول نہ ہوگی اور جو لوگ کافر ہونے کے بعد حالتِ کفر ہی میں مر جائیں اور وہ ساری دنیا کی دولت بھی پیش کریں تو وہ قبول نہ ہوگی اور انہیں عذاب دردناک بھگتنا پڑے گا۔"

(آلِ عمران خلاصہ آیات ۸۶ - ۹۲)

اس آخری آیت سے مؤلف کتاب نے وہی نکتۂ لطیفہ اخذ فرمایا ہے کہ یہاں حالتِ کفر میں مر جانے کا ذکر ہے اور اس سے مراد قدرتی موت ہے لہٰذا سزائے ارتداد کی موت ثابت نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر "مر جائیں" کی بجائے "قتل کیے جائیں" ہوتا تب ہی مرتد کی سزائے قتل ثابت ہوتی۔ لیکن اگر "قتل کر دیے جائیں" کہا جاتا تو کیا اس کا مطلب یہ نہ ہوتا کہ مرتد کو قتل نہ کیا جائے تو وہ عذابِ دوزخ سے محفوظ رہے گا گویا ارتداد پروانۂ نجات ہو گیا۔

دوسرا نکتہ لطیفہ (یا بالفاظِ مؤلف قابلِ غور بات) یہ ہے کہ یہاں پر بتایا گیا ہے کہ اگر مرتد سچے دل سے توبہ کرلے تو اسے معاف کر دیا جائے گا۔ لیکن اس کے لیے کوئی میعاد نہیں ہے۔ ہر وقت توبہ قبول ہو سکتی ہے[۲۷] سوائے بسترِ مرگ کے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ مرتد کو توبہ کرنے کے لیے مرتے دم تک مہلت ہے اس لیے وہ واجب القتل نہیں ہے۔ جناب جسٹس رحمٰن کی قلم سے یہ تحریر دیکھ کر میں کانپ گیا۔ آہ! انہیں کوئی بتلائے کہ توبہ کے لیے وقت کا تعین کفر کے برابر گناہ ہے۔ توبہ اور وقت کے باب میں ان کی یہ بے بصیرتی اندوہناک ہے۔ توبہ وہ چیز ہے کہ مرنے کے وقت کا انتظار تو بڑی بات ہے ایک چشم زدن کا توقف بھی گناہ ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے توبہ کرنا چاہیے۔ سزائے موت کے نفاذ میں تو کچھ تاخیر ہو بھی سکتی ہے بسترِ مرگ پر پہنچنے میں پلک جھپکانے کی بھی دیر نہیں لگتی۔ یہی وجہ ہے کہ توبہ واستغفار کے لیے وقت کا تعین حرام ہے۔ کسی کو کیا معلوم کہ توبہ کی توفیق ہو یا نہ ہو۔ خدا کا یہ فرمانا کہ اگر وہ توبہ کرلیں تو ان کا جرم ارتداد معاف ہو جائے گا، یہ معنی نہیں رکھتا کہ ان کو توبہ کے لیے بسترِ مرگ کا منتظر رہنا چاہیے اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ مرتد کی سزائے قتل مرنے دم تک ٹالی جاسکتی ہے۔ سزا ٹال بھی دی جائے تو موت کو کون ٹال سکتا ہے چنانچہ تمام فقہاء اس امر پر متفق ہیں کہ مرتد کو مہلت دینا کوئی امر ضروری نہیں ہے۔ اسے فوراً توبہ کرنا چاہیے ورنہ قتل کر دیا جائے۔ بہرحال لفظِ موت سے یہ مفہوم نکالنا کہ مرتد کو مرنے تک کی مہلت دی گئی ہے۔ لہٰذا قتل کی سزا نہیں دی جاسکتی اسے موت کے بہانہ انتظار میں آزاد چھوڑ دینا چاہیے، حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔

ایک اور آیت سے استدلال

مؤلف کتاب کی قوتِ استدلال ناقابلِ رشک ہے کہ وہ قرآن کی ہر ایسی آیت سے جس میں مرتدین کو عذابِ جہنم کی خبر دی گئی ہے۔ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ارتداد کی کوئی سزا اس دنیا میں نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے سورۂ عمران کی آیت ۱۰۶ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ

قیامت میں (مرتدین سے) کہا جائے گا کہ ایمان لانے کے بعد جو تم اس سے برگشتہ ہو گئے تو اب بھگتو اس کا عذاب"! جناب مؤلف کا ارشاد ہے کہ:

"اس سے نہایت واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روز جزا کے دن سے پہلے انہیں کوئی سزا نہ ملے گی" (ص ۳۸)

گویا روز جزا میں جن بداعمالیوں کی سزا کا ذکر آیا ہے وہ تمام بداعمالیاں اس دنیا کے عذاب سے نجات کی سند پا گئی ہیں۔ اسی قاعدہ پر ذرا اس آیت کو دیکھئے:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا (النساء:)

یعنی (مسلمانو!) تم ایک دوسرے کو قتل نہ کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے۔ (اس لیے یہ حکم دیا)، اگر ایسی بات کسی نے عداوت اور ظلم سے کی تو اسے (روزِ قیامت) جہنم واصل کر دیں گے۔

کیا جناب جسٹس کے نزدیک قاتل اس دنیا میں کسی سزا کا مستوجب نہیں، کیونکہ آیت کی رو سے اس کی سزا آخرت پر اٹھا رکھی گئی ہے۔

سورۃ النساء سے استدلال

مرتد کی سزا اس دنیا میں نہ ہونے کے ثبوت میں اس سے بھی قوی دلیل کے طور پر سورۃ النساء کی یہ آیت پیش کی گئی ہے کہ:

"جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے اور بار دگر ایمان لائے لیکن پھر کافر ہو گئے اور اپنے کفر میں اضافہ کر لیا تو اب اللہ انہیں معاف نہ کرے گا۔ نہ راہِ راست پر لائے گا"

اب قوت استدلال ملاحظہ ہو۔ ارشاد ہے کہ:

"جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام سے برگشتہ ہونے پر فوراً ہی اس مرتد کو

قتل کر دینا چاہیئے۔ ان کے نظریہ کے خلاف یہ اعلان ایک فیصلہ کن ضرب ہے
کیونکہ اس آیت سے عیاں ہے کہ وہ لوگ بار بار مرتد ہوئے لیکن کسی مرتبہ
بھی انہیں سزا (سزائے موت) نہ دی گئی۔ اگر مرتد کی سزا قتل ہوتی تو پہلے
ہی بار انہیں سزا مل جاتی۔ بار بار مرتد ہونے کا موقع کہاں سے ملتا ———
لہٰذا ثابت ہوا کہ مرتد کی سزا قتل نہیں ہے"

ایک عام فراست کا آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ فوراً قتل کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہاتھ لگتے ہی یا قابو پاتے ہی قتل کر دیا جائے۔ جیسا کہ قرآن میں کئی جگہ آ چکا ہے، لیکن اگر قتل کے حکم کا نفاذ ہونے سے پہلے کوئی شخص پھر ایمان لے آئے تو اس کو قتل نہ کیا جائے۔ یہی صورت حال دوسری تیسری بار بھی پیش آ سکتی ہے۔ تاہم کلام الٰہی پر غور کرنے والوں میں سے کچھ نے یہ سمجھا کہ تین بار کے بعد ایمان بے سود ہو گا اور کچھ نے کہا کہ حالتِ ایمان میں کسی کو قتل نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ کتنی ہی بار ایمان سے پھرے۔ اور اس دوران اسے قید میں رکھا جائے گا۔ لیکن یہ نکتۂ لطیفہ کہ مرتد سے قطعاً باز پرس نہ ہوگی اور تمام زندگی اسے آزاد چھوڑ دیا جائے، جناب مؤلف ہی کا حصہ ہے۔ قرآن کی کسی آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے۔

آیت سورۂ مائدہ سے استدلال

اسی طرح سورۃ المائدہ کی آیات ع ۸ کا مفہوم یہ ہے کہ:۔

" اے ایمان والو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے برگشتہ ہو جائے
تو آئندہ اللہ (ان کی بجائے) ایسے لوگ پیدا کرے گا جنہیں اللہ پسند کرتا
ہے اور جو اللہ کو پسند کرتے ہیں۔ ایمانداروں کے نیاز مند ہوں گے اور
بے ایمانوں کے حق میں سخت ہوں گے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور
کسی کے اعتراض کی پروا نہ کریں گے"

جناب مؤلف نے اس آیت کے باب میں مفسرین طبری، قرطبی، زمخشری، رازی

اور طبرسی کے خیالات کا خلاصہ یہ بیان فرمایا ہے کہ اس آیت میں ایک تنبیہ اور ایک پیشگوئی ہے۔ تنبیہ یہ ہے کہ کسی کے مرتد ہو جانے سے اللہ کا کچھ نہ بگڑے گا اور پیشگوئی یہ ہے کہ اللہ ان کی بجائے صحیح الخیال مسلمانوں کو منظر عام پر لے آئے گا۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ ان آیات سے جو اہم نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مرتد کو اس جہاں میں کوئی سزا نہیں ہے [۴۶]

اس اہم نتیجہ کے اخذ کرنے پر اہل عقل حیران ہیں کہ اگر مرتد کو اس جہان میں کوئی سزا نہیں تو آخر یہ کن بے ایمانوں کے ساتھ سختی کرنے اور جہاد کرنے کا حکم ہے۔ جو ان مرتدوں کو نیست و نابود کر کے ان کی جگہ متمکن ہوں گے۔ مولانا وحید الزمان حیدر آبادی فرماتے ہیں کہ:

"یہ جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پیدا کرے گا جن سے اللہ محبت کرے گا اس سے مراد ابوبکر صدیقؓ اور ان کے ساتھی صحابہ اور تابعین ہیں جنہوں نے مرتد لوگوں سے جہاد کیا اور ان کا کام تمام کیا...... اور جس وقت ان لوگوں سے لڑنے کا قصد کیا تو بعض صحابہ نے کہا وہ اہل قبلہ ہیں ان سے کیوں لڑتے ہو ابوبکر صدیق نے اپنی تلوار حمائل کی اور اکیلے لڑنے کے لیے نکلے۔ آخر سب صحابہ بھی ان کے پیچھے نکلے۔ ابن مسعود نے کہا کہ شروع میں تو ہم نے اس کو برا سمجھا لیکن آخر میں ان کی تعریف کرنے لگے۔" (تبویب القرآن ولی حاشیہ [۴۷])

واضح ہو کہ اس آیت میں وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (یعنی کسی کے اعتراض کی پرواہ نہ کریں گے) جو آیا ہے وہ اس واقعہ کی پیش گوئی ہے۔

غرض اس آیت سے تو جناب مؤلف کے علی الرغم ان مرتدوں کے ساتھ جہاد کرنے اور ان کے تباہ و برباد کر دینے کا ذکر ہے۔ یہ نتیجہ کہاں سے نکلا کہ اس دنیا میں ان کی کوئی سزا نہیں

آیتِ النحل سے استدلال

مؤلف کتاب نے اپنی اس طرح کی غیر معمولی صلاحیتِ استدلال سے چند اور ایسی آیاتِ قرآنی سے جن میں مرتدین کو عذابِ جہنم کی خبر دی گئی ہے یہ نتیجہ اخذ فرمایا ہے کہ دنیا میں وہ کسی

سزا کے مستوجب نہیں ہیں مثلاً (النحل کی آیت ۱۰۶) جس کا مفہوم یہ ہے کہ:

"جن لوگوں کو اسلام سے برگشتہ ہونے پر مجبور نہ کیا گیا ہو اور وہ بخوشی خاطر اپنے ایمان سے پھر گئے۔ ان پر اللہ تعالیٰ کا عتاب ہے اور انجام سخت ہولناک ہے۔"

جناب جسٹس فرماتے ہیں کہ اس آیت میں مرتد کا انجام آخرت پر انحصار رکھا گیا ہے۔[۲۶] یعنی اس دنیا میں ان سے کوئی باز پرس نہیں ہے۔ بقول ان کے سمرائی نے کہیں قرطبی کا یہ قول نقل کر دیا کہ اس آیت میں عتاب الٰہی کے سوا کسی اور عذاب کا ذکر نہیں ہے۔ ہمارے محترم مؤلف کو یہ شگوفہ ہاتھ آگیا کہ مرتد محض عتاب الٰہی کا مستحق ہو کر رہ جائے گا۔ اسے کوئی اور سزا نہ ملے گی۔ کاش! عتاب الٰہی کے معنی پر وہ غور فرما لیتے تو یہ الفاظ ان کے منہ سے ہرگز نہ نکلتے۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ مسیحی مستشرق سموئل زویمر نے بھی اس آیت کے باب میں یہ گہر فشانی کر دی کہ "سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۷ کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے قتل مرتد کا جو حکم نکالا ہے وہ محض خیالی ہے۔ ڈاکٹر زویمر کے نزدیک محض تفسیر خازن کا قول اس خیال کے تائید کے لیے کافی نہیں۔ ڈاکٹر زویمر کی تائید نہ ہوتی تو شاید ہم کچھ اور کہہ سکتے۔ سر دست صرف اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ اس آیت میں مرتد پر دوہرے عذاب کا ذکر ہے۔ ایک عتاب الٰہی اور دوسرا انجام ہولناک۔ یعنی ہولناک انجام سے پہلے بھی ایک عذاب کا ذکر ہے۔ اس سے تو بدلالۃ النص یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرتد آخرت کے عذاب کے علاوہ بھی اور عذاب کا مستحق ہے اور نہ تو کسی طرح نہیں ثابت ہوتا کہ مرتد عتاب دنیا سے مستثنیٰ ہوگا۔

آیت سورۃ الحج سے استدلال

اسی طرح کی ایک اور دلیل ملاحظہ ہو۔ سورہ الحج ع ۲ کی ایک آیت کا مفہوم ہے کہ:

"ایک شخص اللہ کی عبادت تذبذب کے عالم میں کرتا ہے۔ فائدہ نظر آیا

تو جمارہا۔ آزمائش میں پڑا ..... تو منہ موڑ لیا۔ اس کے ہاتھ سے دنیا بھی گئی اور دین بھی"۔ (ص ۴۲)

مؤلفِ کتاب کا کہنا ہے کہ ہر چند کہ مختلف مفسرین نے اس آیت کا مصداق مختلف اشخاص کو قرار دیا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی کی بابت ارتداد کے جرم میں سزائے موت پانے کا تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ لہٰذا قتلِ مرتد کی سزا ثابت نہیں ہے۔ شاید یہ دعوٰے مان لیا جاتا اگر ایسے اشخاص کا تعین اور ان کے مرتد ہونے کا ثبوت اور سزا نہ پانے کی تحقیق ہوتی۔

اول تو اس آیت میں ارتداد کا ذکر نہیں ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ کے معنے یہ ہیں کہ کوئی شخص ایسا ہے کہ اللہ کی عبادت کرتا ہے لیکن بے یقینی کے عالم میں: ممکن ہے کہ کچھ لوگ مکاری یا کسی خود غرضی کی بنا پر عبادت میں شریک ہو جاتے ہوں اور فی الواقع مسلمان نہ ہوئے ہوں، جیسا کہ بعض منافقین کا شیوہ تھا کہ مسلمان نہ تھے لیکن مسلمان ہونے سے انکار بھی نہ کرتے تھے۔ قطع نظر اس کے کہ اسی آیت میں ایسے لوگوں کا انجام بھی یہی ہے کہ خسر الدنیا والآخرۃ" ہو گئے۔ دنیا کا خسران موت اور آخرت کا خسران نجات سے محرومی۔ غرض اس آیت سے بھی اشارۃً مرتد کی سزائے موت ثابت ہوتی ہے۔ معافی کا مفہوم تو کسی طرح بھی نہیں نکلتا۔

آیت سورۂ محمدؐ سے استدلال

اس دعوے کے ثبوت میں کہ مرتد مستوجبِ تعزیر نہیں ہے جناب مؤلف نے سورۂ محمدؐ ع ۴ کی ایک آیت پیش کی گئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ:

"جو لوگ ایمان نہیں لائے اور دوسروں کو بھی راہِ حق سے روکتے ہیں اور راہِ ہدایت واضح ہو جانے کے بعد بھی پیغمبر کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ لوگ اللہ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے بلکہ ان کی یہ تمام کوششیں رائگاں ہیں

ہر چند کہ اس آیت میں مرتد کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ تو صاف ان لوگوں کے بارے میں ہے

جو ایمان نہیں لائے اور دوسروں کو بھی اسلام لانے سے روکتے ہیں۔ تاہم محترم مؤلف کا ارشاد ہے کہ اس آیت سے مرتد کی سزائے موت ثابت نہیں (لہذا مرتد کی کوئی دنیوی سزا نہیں ہے)

انہیں اختیار ہے کہ قرآن کا جو مطلب چاہیں وہ نکالیں لیکن میرے لیے یہ امر نہایت ہی المناک ہے کہ جناب جسٹس رحمٰن جیسی مقتدر شخصیت کو ان کے معاونین نے جھوٹے حوالے دیکر انہیں کس طرح بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ ایک مثال یہ بھی ہے۔ لکھا ہے کہ:۔

"Al-Samarai observes that this verse may possibly be in respect of disbelievers or may concern apostates"

یعنی علامہ سمرائی کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت ہو سکتا ہے کہ کفار کے بارے میں ہو اور یا اس کا تعلق مرتدین سے ہو" (بحوالہ احکام المرتد ص۳۳)

اب السمرائی کی کتاب احکام المرتد کا ص۳۳ دیکھیے۔ علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ:۔

"الآیۃ تحتمل ان تکون فی الکفار او المنافقین"

جناب مؤلف نے لفظ "منافقین" کی بجائے "مرتدین" کو ٹھونسنے کی کوشش صرف اس لیے فرمائی ہے کہ یہ آیت مرتدین کے حق میں ثابت ہو اور چونکہ اس میں ان کی سزا کا ذکر نہیں ہے اس لیے یہ کہا جا سکے کہ مرتد کی کوئی سزا نہیں۔ مؤلف کتاب کے معاونین کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ جھوٹ بول کر کسی دعوے کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

محترم مؤلف کتاب نے مندرجہ بالا کم و بیش ایک درجن آیات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرتد کو سزائے موت کا مستوجب قرار دینا قرآن کے خلاف ہے لیکن اس طریق استدلال کو جو اوپر ذکر کیا گیا ہے اگر معقول سمجھا جائے تو قرآن کی ہر آیت سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے کہ مرتد مستوجب تعزیر نہیں۔ کیوں کہ ہر آیت میں مرتد کا ذکر نہیں ہے۔ لہذا وہ واجب التعزیر نہیں بلکہ بالفاظ مسٹر پرویز ارتداد جرم ہی نہیں لہذا سزا کیسی؟ (ماہنامہ قتل مرتد ص۳۰)

مرتد اور منافق

آیاتِ بالا سے استدلال کے بعد مؤلف نے چند ایسی آیات پیش کی ہیں جن میں منافقین کا ذکر ہے، مرتدین کا نہیں لیکن جس طرح انہوں نے کافروں اور مرتدوں کو ایک پلڑے میں رکھ کر دونوں میں کوئی فرق نہیں سمجھا اسی طرح ان کا ارشاد ہے کہ :۔

"قرآن میں منافقوں اور مرتدوں کی ایک ہی حیثیت قرار دی ہے" (ص ۵۵)

یہ دوسری صریح غلط بیانی ہے۔ مرتد وہ ہے جو مسلمان ہو کر دین سے پھر جائے اور منافق وہ ہے جو مسلمان ہوتا ہی نہیں۔ وہ زبان سے خواہ کچھ کہے وہ بہر حال کافر ہی ہوتا ہے۔ اسلام نے اسلام لا کر اس سے برگشتہ ہو جانے کو واجب التعزیر قرار دیا ہے اور منافق کو کفار ہی کے زمرہ میں رکھا گیا ہے۔ شاید مؤلف اپنے اس اعتراف کو بھول گئے جو اسی کتاب میں انہوں نے قرآن حکیم کی دو آیتیں پیش کرنے کے بعد فرمایا ص ۵۲ —

"ان آیتوں کی رو سے منافقوں کو کافروں سے ادنیٰ حیثیت میں یا کم از کم ان دونوں کو مستحقِ عذابِ آخرت ہونے میں ایک ہی حیثیت میں رکھا گیا ہے" لیکن انہوں نے منافقوں اور مرتدوں کی بھی ایک ہی حیثیت قرار دی ہے۔ حالانکہ مرتد وہ ہے جو مسلمان ہو کر اسلام سے پھر جائے لیکن کافر اور منافق مسلمان ہوتے ہی نہیں۔ مرتد کو دنیا میں کفر کی نہیں بلکہ ارتداد کی سزا ملتی ہے جو کہ فتنہ انگیزی کا موجب ہے لیکن چونکہ وہ کافر بھی ہوتا ہے لہذا سزائے آخرت کا بھی مستحق ہے۔ ہاں منافق اور کافر کو ایک ہی حیثیت دی جا سکتی ہے کہ وہ دونوں کافر ہوتے ہیں۔ نفاق اور ارتداد کا فرق جیسا کہ اوپر بتایا گیا بالکل واضح ہے۔ اس کے علاوہ نفاق ایک ایسا جرم ہے جس کا ثبوت شہادت سے نہیں ہو سکتا۔ منافق اگر خود بھی کہے کہ میں منافق ہوں تو اس کا قول قابلِ اعتبار نہیں ہے۔

مؤلف نے اپنی اس کتاب میں اس امر کو بہت اہمیت دی ہے کہ ان آیات میں منافق کے ساتھ سختی کرنے کی اجازت کہیں بھی نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ کھلی عداوت

پر اتر آئیں تو ان کے ساتھ جنگ کی جائے اور انہیں ہلاک کر دیا جائے۔ ص۵۱
لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ منافق کے علاوہ آیا کوئی ایسا شخص بھی جو اسلام سے کھلی عداوت پر اتر آئے اور برسرِ جنگ ہو تو اس سے جنگ نہ کی جائے اور نہ اس کو گزند پہنچائی جائے؟ اگر ایسا نہیں ہے۔ تو آخر منافق کا شاخسانہ لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا الذہبی کی اس سے زیادہ بہتر کوئی مثال مل سکتی ہے؟ کیا انہیں معلوم نہیں کہ مسلمان بھی اگر آمادۂ حرب ہو جائے تو قابلِ سرزنش اور واجب القتل ہے؟ تفصیل لاحاصل ہے۔

دو اور آیتیں

سزائے قتلِ مرتد کے خلاف مؤلف نے آخر میں دو اور آیتیں پیش کی ہیں جن کا تعلق بھی منافقین سے ہے۔ ان کا مفہوم یہ ہے:

۱۔ یاد رکھو کہ خدا منافقین اور کافرین کو اکٹھا کر کے جہنم میں ڈال دے گا۔ (النساء ۱۴۰)

۲۔ یاد رکھو کہ منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ڈال دیے جائیں گے اور آپ دیکھیں گے کہ ان کا وہاں کوئی حامی نہ ہو گا۔ (النساء: ۱۴۵)

ظاہر ہے کہ ان آیات کا ارتداد سے کوئی تعلق نہیں تاہم مؤلفِ کتاب نے لکھا ہے کہ منافقین کی حیثیت مرتدین سے مختلف نہیں ہوتی۔ حالانکہ قرآن میں منافقین کو کسی مرحلہ پر مسلمان قرار ہی نہیں دیا گیا۔ ان کے قسم کھانے پر بھی انہیں مسلمان نہیں مانا گیا، تو ان کو جرمِ ارتداد کا مرتکب کیسے کہا جا سکتا ہے۔ یہ بار بار عرض کیا جا چکا ہے کہ مرتد اسلام سے برگشتہ ہو جانے کی وجہ سے دنیا میں مستوجبِ سزا ہوتا ہے۔ باقی رہی کفر کی سزا۔ سو وہ آخرت پر موقوف ہے۔ منافقین کی متعلقہ چند آیات اور ان کے عبرتناک انجام کو بتاتے ہوئے مؤلفِ کتاب کا کہنا ہے کہ باوجود اس کے کہ پیغمبر کی دعا بھی ان کے حق میں مقبول نہیں ہوئی تاہم انہیں طبعی موت مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے یعنی سزا نہیں دی گئی لہٰذا مرتدین کو بھی طبعی موت مرنے کے لیے چھوڑ دینا چاہیئے اور سزا نہیں۔ لیکن یہ دلیل لغو ہے ـــــ جس کو

قیاس مع الفارق کہتے ہیں۔ یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ منافقوں کا ذکر ہے اور منافق یا کافر مستوجب سزائے دنیوی ہے ہی نہیں۔ معہذا طبعی موت کے بعد سزائے عذاب کو یہاں کی سزا سے نجات کا ثبوت سمجھنا بھی درست نہیں ہے۔

سورۂ منافقین کی آیت سے استدلال

جناب مؤلف کا ارشاد ہے کہ سورہ منافقین کی چوتھی آیت میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ یہ (منافقین) پہلے ایمان لائے اور پھر کافر ہو گئے لیکن اس جرم کی پاداش میں انکی گردن نہیں ماری گئی۔

درحقیقت یہاں پر پھر جناب موصوف نے احمقوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے اول تو یہ آیت چوتھی نہیں تیسری ہے اور پہلی دو آیات میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ:۔

"منافق لوگ جب آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم حلف اٹھاتے ہیں کہ (اے محمدؐ!) آپ بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں اور یہ تو اللہ جانتا ہی ہے کہ تم رسول ہو لیکن یہ بھی اللہ فرماتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔ انھوں نے اس قسم کو (اپنی جان بچانے کے لیے) ڈھال بنا لیا ہے اور دوسروں کو ایمان لانے سے روکا اور اس کی ضرورت انہیں اس لیے پڑی کہ انھوں نے کلمہ ایمان منہ سے کہا پھر کلمہ کفر کہنے لگے تو اب ان کے دل پر مہر لگ گئی ہے یعنی ایمان نہیں لائیں گے۔"

حقیقت یہ ہے کہ ان آیات سے بھی بدلائل النص مرتد کا مستوجب قتل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ بظاہر مرتدوں کا سا عمل کیا کہ اظہارِ ایمان کیا اور پھر مرتد ہو گئے اور مستوجب قتل ٹھہرے لیکن قسم کھا کر اپنی جان بچائی یعنی ایمان کا اظہار ان کی جان بچنے کا سبب بن گیا دیکھیے قرآن کے سمجھنے والوں نے الفاظ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا کے معنے یہ کیے ہیں:۔

نطقوا بکلمۃ الشہادت ثم ظہر کفرھم بعد ذالک ———— یا

ینطقوا بالایمان عند المومنین ثم نطقوا بالکفر عند شیاطینھم (مدارک)

"یعنی زبان سے کلمۂ شہادت ادا کیا پھر بعد میں ان کا کفر ظاہر ہوگیا"۔۔۔یا یہ معنی، "کہ مسلمانوں کے سامنے زبان سے اظہارِ ایمان کیا پھر اپنے شیطان دوستوں کے سامنے کفر کا اظہار کیا"

لیکن یہ مفہوم کہ وہ واقعتہً مسلمان ہوگئے تھے اور بعد میں مرتد ہوگئے نہیں لیا گیا اور کیوں کر ممکن تھا جبکہ اللہ خود شاہد ہے کہ وہ مسلمان ہوئے ہی نہ تھے۔

بہر حال قرآن حکیم کے الفاظ اِتَّخَذُوٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً یعنی اپنی قسم کو انھوں نے اپنی جان بچانے کا ذریعہ بنایا۔ اس بات کی دلیل ہیں کہ انہیں اپنے ان کرتوتوں سے جان کا خطرہ تھا۔ اگر قسم کھا کر کلمۂ شہادت نہ پڑھ لیتے تو بلاشبہ وہ مرتد ہوتے اور قتل کر دیے جاتے۔ مؤلفِ کتاب سے میری درخواست ہے کہ وہ ایک بار پھر غور فرمائیں کہ آخر ایک منافق کو قسم کھا کر اپنی جان بچانے کی کیا ضرورت تھی۔ جبکہ منافقین کو یوں بھی مستوجب سزائے موت نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کا سبب یہی ہے کہ بظاہر ان کا طرزِ عمل مرتدین کا تھا۔ گو حقیقت میں وہ مرتد نہ تھے بلکہ کافر اور منافق تھے۔

مجھے امید ہے کہ ان واضح اشارات کے بعد مؤلفِ کتاب نے جو لکھا ہے کہ قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں صرف یہی نہیں کہ مرتد کی کوئی سزا نہیں ہے بلکہ اسے (زندہ رہنے اور) اپنی موت مرنے کا حق ہے۔ اس سے توبہ فرمائیں گے۔

(۷)

اس سے زیادہ مشکل مرحلہ

اس کے بعد مؤلفِ کتاب کے لیے اس سے بھی زیادہ مشکل مرحلہ آتا ہے۔ کیوں کہ ارتداد کی سزا قتل جو قرآن کی آیات سے بدلالت النص اسی طرح ثابت ہے جس طرح ناحق قتل کی سزا۔ احادیث میں اس کی صاف صاف وضاحت اور صراحت موجود ہے۔۔۔ اگر

مسٹر پرویز کی طرح وہ بھی احادیث کا انکار کر دیتے تو شاید ان کا کام آسان ہو جاتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ انہوں نے حدیث سے انکار نہیں کیا بلکہ اس کی تاویل کی کوشش فرمائی ہے۔ لیکن جس طرح کی تاویل سے انہوں نے کام لیا ہے وہ شاید انکار سے کم نہیں۔

احادیث کی روشنی میں قتل مرتد پر غور کرنے سے پیشتر انہوں نے ایک خاصی لمبی تمہید بیان فرمائی جس کی غرض ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ سزائے مرتد کے باب میں جو کچھ وہ فرمانا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے زمین ہموار کی جائے۔ ص۵۶

قرآن وحدیث میں تقابل

سب سے پہلے انہوں نے قرآن اور حدیث دونوں کی حیثیت پر تبصرہ فرمایا اور بتایا ہے کہ کوئی حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ قرآن کے مقابلہ میں حدیث کی ثانوی حیثیت ہے اور کتب احادیث میں چند ہی کتابیں ہیں جن کو اولیت کا درجہ دیا جا سکتا ہے اور ایسی احادیث بھی بہت ہیں جو من گھڑت ہیں اور سب سے کم درجہ پر خبر احاد ہے۔ انسانی فطرت میں بھول چوک کو بہت بڑا دخل ہے اس کو خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے ایک بار حضرت عمرؓ کی ایک غلطی پر انہیں آگاہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس حدیث کو یا تو عمرؓ نے اچھی طرح یاد نہیں رکھا اور یا وہ سمجھے نہیں۔ حضرت عائشہ کا فرمانا ہے کہ حدیث کبھی قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ اور یہ کہ حدیث صرف قرآن کی تشریح ہے اس کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ ان معقول خیالات کی تائید میں انہوں نے حضرت امام شافعیؒ، مولانا بدر عالم ندویؒ، امام شاطبیؒ امام تفتازانی، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، امام مالکؒ اور ملا علی قاریؒ وغیرہم کے اقوال اور احادیث کی قوت وضعف اور صحیح وموضوع ہونے پر طویل بحث فرمائی ہے اور مقصد صرف یہ تھا کہ حدیث سے ثابت ہونے والے ہر حکم کو محل نظر قرار دیا جا سکے اور جہاں کہیں بھی کوئی حدیث ان کے خود ساختہ قرآنی مفہوم پر منطبق نہ ہو وہ اسے بہ آسانی قرآن کے خلاف بتا کر ناقابل اعتبار کر دیں۔ قتل مرتد کے باب میں مؤلف کتاب کے تمام دلائل جن

مرکز کے گرد گھومتے ہیں وہ یہ ہے کہ قرآن آزادی فکر کا علمبردار ہے اور مرتد کا قتل آزادی فکر کے خلاف ہے۔ لہٰذا اسلام میں مرتد کی کوئی دنیوی سزا نہیں ہے اور جو شخص یہ خیال کرتا ہے وہ قرآن کے خلاف اور نتیجۃً اسلام کے خلاف ہے۔

قتلِ مرتد کی احادیث

اب قبل اس کے کہ ہم احادیث کی روشنی میں ان کے دلائل پر نظر ڈالیں، مؤلفِ کتاب کی مندرجہ بالا تحریر کے نتائج پر غور کر لینا مناسب ہوگا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جن اصحاب کے ارشادات سے مؤلفِ کتاب نے احادیث کی یہ حیثیت بتائی ہے۔ آیا وہ اصحاب خود بھی قرآن اور احادیث کی اس حیثیت سے واقف تھے یا نہیں؟ اگر باوجود واقف ہونے کے کہ سزائے قتل مرتد قرآن کے خلاف ہے، ان کا فتوے بھی یہی ہے کہ مرتد کو قتل کیا جائے تو کیا وہ دیدہ و دانستہ قرآن کے خلاف کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ یا یہ کہ یہ منافقانہ رویہ ہی عینِ اسلام ہے۔ بشکل یہ ہے کہ یہ سلسلہ محض معدودے چند ابطالِ ملت اور بزرگانِ دین کا نہیں بلکہ مفسرین و محدثینِ متقدمین و متاخرین میں سے ایک فردِ واحد نے بھی اس حکم کو قرآن کے خلاف نہیں بتایا بلکہ اس کی تائید کی اور اس پر عملدرآمد کا حکم دیا۔ آخر یہ قرآنی بصیرت کس گوشۂ خمول میں تھی اور اس عہد میں یک بیک کہاں سے ابل پڑی؟ اگر آزادئ فکر کی یہ برکت جاری رہی تو ہمیں اندیشہ ہے کہ ایک روز خود جناب مؤلف بھی اس سے تنگ آکر آپ ہی اس قرآنی بصیرت سے متنفر ہو جائیں گے۔

اب احادیث کی روشنی میں جس نقطۂ نظر سے جناب مؤلف نے اس مسئلہ پر غور فرمایا ہے اس کی تفصیل سنیئے، فرماتے ہیں:

"مرتد کے لیے سزائے قتل کی عمارت جس بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے وہ ابنِ عباس کی روایت کردہ یہ حدیث ہے کہ جو شخص اپنا مذہب تبدیل کرتا ہے اسے قتل کر دو"۔

(من بدل دینہ فاقتلوہ) ایک اور روایت میں حدیث کے الفاظ اس طرح آئے ہیں من غیر دینہ فاضربوا عنقہ (جو شخص اپنے دین سے پھر جائے اس کی گردن کاٹ دو)

یہ حدیث مذکور کم و بیش ۱۲ صحابیوں سے مروی ہے جس میں خلفائے اربعہ کے علاوہ حضرت معاذ، ابو موسیٰ، ابن عباس اور خالد وغیرہ اصحاب رسول اللہ شامل ہیں اور ملت اسلامیہ کے جتنے ارباب علم ہیں وہ سب اس حدیث کی بنا پر متفق ہیں کہ مرتد واجب القتل ہے۔

(مغنی ابن قدامہ المتوفی ۶۳۰ھ ص)

یہ کتاب علامہ خرقی المتوفی ۳۳۴ھ کی شرح ہے۔ جس میں مرتد کی تعریف یہ بتائی گئی ہے کہ جو مسلمان دین سے پھر جائے وہ مرتد ہے۔ حدیث کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں اس کا ذکر نہ ہو اور کوئی محدث ایسا نہیں جس نے اس کا مطلب سوا اس کے اور کچھ نکالا ہو کہ جرم ارتداد مستوجب قتل ہے۔

ایک اور حدیث

۲۔ اس کے علاوہ منجملہ ان احادیث کے جن سے حکم قتل مرتد ثابت ہے۔ یہ حدیث خاص طور پر بہت مشہور ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ:

"حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان تین مواقع کے سوا کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہے کسی شادی شدہ شخص نے بدکاری کی ہو تو اس کو سنگسار کیا جائے گا۔ اور دانستہ قتل (ناحق) کرنے والا قصاص میں ہلاک کیا جائے گا اور جو شخص اپنے مذہب اسلام سے پھر جائے گا تو اس کا قتل کیا جانا لازمی ہے"

یہی حدیث کئی طریقوں اور الفاظ کے فرق کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی مروی ہے کہ جو شخص خدا کی وحدانیت اور میری رسالت کی شہادت دے دے۔ ان تین صورتوں کے علاوہ اس کا خون بہانا جائز نہیں ہے۔ یا تو جان کے بدلے جان یا شادی شدہ

زنا کا مرتکب ہو یا اپنا ایمان چھوڑ کر اپنی ملت سے علیحدہ ہو جائے۔

حدیث پر عمل درآمد کی بابت ابو قلابہ بیان فرماتے ہیں کہ:

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی پر حد (شرعی سزا) نافذ نہیں فرمائی۔ تا آن کہ اس نے ان تین جرائم میں سے کسی کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ وہ جس نے ناحق قتل کیا ہو یا وہ شادی شدہ جو زنا کا مرتکب ہوا ہو اور یا وہ شخص جو اسلام سے برگشتہ ہو اور خدا اور اس کے رسول سے برسرِ جنگ ہو۔ (بخاری جلد ۲۔ کتاب الدیۃ)

۳۔ صحیح ابوداؤد میں ایک حدیث بدیں مضمون وارد ہے کہ اگر ایک بندۂ خدا شرک کی راہ اختیار کرے تو اس کا قتل روا ہو جاتا ہے۔

یہ وہ احادیث ہیں جن کو مؤلفِ کتاب نے خود نقل فرمایا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد احادیث منقول ہیں جن کا مدعا سوا اس کے کچھ نہیں ہے کہ اسلام سے برگشتہ ہونے کی سزا قتل ہے۔ ان احادیث میں سے کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں جس میں ارتداد کے ساتھ محاربہ کی قید لگائی گئی ہو۔ یہ شرط صرف مؤلفِ کتاب کے ذہن کی پیداوار ہے۔

کیا قتلِ مرتد کا حکم اسلام کے خلاف ہے؟

ظاہر ہے کہ اتنی وضاحتوں کے بعد سزائے قتلِ مرتد کو اسلام کے خلاف ثابت کرنا سخت دشوار تھا۔ مؤلفِ کتاب کو اس کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہوں گے۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

سب سے پہلے انہوں نے مختلف راویوں کے بیان میں اختلافِ الفاظ کا سہارا پکڑا حالانکہ مفہوم کے اعتبار سے کسی میں ذرہ برابر بھی اختلاف نہیں۔ فاضل مؤلف اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان اختلافات کو قرآنی نص سے مطابق کرنے کی صرف ایک ہی سبیل ہے کہ مرتدین واجب القتل سے صرف وہی لوگ مراد لیے جائیں جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہوں۔ صفحہ ۶۹-۷۰ باقی مرتد واجب القتل نہیں ہیں۔ حالانکہ اسلام نے ایسے اشخاص کو جو مسلمانوں سے برسرِ جنگ

ہیں، واجب القتل نہیں گردانا بلکہ وہ واجب القتال ہیں۔ حتی کہ بعض صورتوں میں مرتد بھی اگر حربیوں سے جا ملے اور مسلمانوں سے برسرِ جنگ ہو تو وہ واجب القتل نہیں رہتا، بلکہ واجب الدفع یا واجب القتال ہوتا ہے۔ لیکن مرتد بہر حال واجب القتل ہوتا ہے۔ سوا ان کے جنہیں قتل کرنا منع ہے۔

محدثین نے قرآن سے صرفِ نظر کیا

مؤلف کا خیال ہے کہ یہ تمام محدثین ایک ہی رٹ لگاتے رہے اور کسی نے قرآن حکیم کی سورۂ مائدہ آیت ۳۳ کے الفاظ و معانی کے پیش نظر ان احادیث کی تاویل نہ کی۔ اس مقام پر سورہ مائدہ کی اس آیت کا ترجمہ نقل نہیں کیا۔ راقم اس کا ترجمہ تفسیر ماجدی سے نقل کرتا ہے:

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے میں لگے رہتے ہیں ان کی سزا بس یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا سولی دیے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پیر مخالف سمتوں سے کاٹ دیے جائیں یہ تو ان کی رسوائی دنیا میں ہوئی اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے مگر جو لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پا جاؤ تو جانتے رہو کہ بیشک اللہ بڑا مغفرت والا اور بڑا رحمت والا ہے"

اب مؤلف سے کون پوچھے کہ آخر اس آیت کو مرتدین سے منسوب کرنے کا کس طرح امکان ہے۔ بیشتر مفسرین اور تمام فقہاء نے یہی بتایا ہے کہ یہ آیت رہزنوں کے بارے میں ہے لیکن جناب مؤلف اسے مرتدین کے حق میں خیال فرماتے ہیں۔ حالانکہ علامہ جصاص نے یہ وضاحت فرما دی ہے کہ بعض غیر مستند مفسرین نے جو یہ سمجھا ہے کہ یہ مرتدین کے حق میں ہے وہ سرتاسر لغو و باطل ہے (حاشیہ تفسیر ماجدی زیر آیت)

مقام حیرت ہے کہ جناب مؤلف نے اس سرتاسر لغو اور باطل قول کو اپنی دلیل کی بنیاد

قرار دیا۔ معہذا اس سے یہ کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتا کہ جرم ارتداد محض واجب القتل نہیں ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ سزائیں صرف ایسے مرتدین کیلئے ہیں جو جرائم رہزنی، نہب، قتل و غارت کا ارتکاب کریں۔ باقی اگر کوئی اور کرے تو وہ سزا کا مستوجب نہیں ہے۔ اس خیال کی حماقت بیان کرتے ہوئے علامہ جصاص نے فرمایا کہ یہ جرم مسلمان کرے تو اس کی بھی یہی سزا ہے۔

ہمارے فاضل مؤلف نے سزائے مرتد کے بارے میں بھی یہی موقف اختیار فرمایا ہے کہ اگر وہ آمادہ جنگ ہو جائے تب ہی واجب القتل ہے یہاں پر بھی بالفاظ جصاص یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا مرتد کے سوا کوئی اور شخص مسلمانوں سے آمادۂ جنگ ہو تو ان کے نزدیک واجب القتل نہیں ہے؟ پھر آخر ان کی تمام کتاب اس نظریہ سے کیوں بھری پڑی ہے کہ مرتد حربی نہ ہو تو واجب القتل نہیں ہے۔

قتل مرتد کا فیصلہ کن حکم

مرتد کے مستوجب سزائے موت ہونے کے بارے میں آثار صحابہ سے ایک نہایت واضح فیصلہ بخاری کی حدیث باب حکم المرتد سے خود فاضل مصنف نے نقل فرمایا ہے کہ:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو یمن میں گورنر بنا کر بھیجا اور بعد میں حضرت معاذ بن جبل کو بھی وہاں جانے کا حکم ہوا۔ جب معاذ وہاں پہنچے تو حضرت ابوموسیٰ نے انہیں خوش آمدید کہا اور تشریف رکھنے کے لیے فرمایا۔ اتفاقاً اسی وقت ایک یہودی گرفتار ہو کر ان کے سامنے اسی جرم کی پاداش میں پیش ہوا کہ وہ مسلمان ہو گیا تھا لیکن اسلام سے پھر گیا۔ حضرت معاذ ہنوز بیٹھے نہ تھے۔ آپ نے فرمایا کہ جب تک قرآن خدا اور رسول کے مطابق اس مرتد کو موت کے گھاٹ نہ اتار دیا جائے گا میں نہیں بیٹھوں گا۔ چنانچہ پہلے اسے قتل کیا گیا تب آپ تشریف فرما ہوئے۔"

اس واقعہ کی تاویل فرمانے کی ہمت فاضل مؤلف کے علاوہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ انہوں نے اس واقعہ کو مرتد کی سزائے موت ہونے سے انکار کر دیا اور قیاس آرائی کے میدان میں اسپ تازی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ بہت ممکن ہے وہ یہودی اسود عنسی کے باغی گروہ میں شامل ہو گیا ہو۔ اور محض ارتداد کی بنا پر قتل نہ کیا گیا ہو۔ یعنی گورنر کے سامنے جس جرم کی بنا پر وہ قتل کیا گیا وہ جرم بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ ایسا جرم بیان کیا گیا جس کی سزا قتل نہیں ہے اور پھر بھی قتل کیا گیا۔ میں باادب درخواست کروں گا کہ کیا فاضل مؤلف نے اپنی قانونی زندگی میں کبھی کسی مجرم کو ایسی سزا دی جس کے جرم کا ذکر ہی استغاثہ میں نہ ہو بلکہ ناقابلِ تعزیر جرم عائد کیا گیا ہو اور قابلِ تعزیر جرم کی سزا سنا دی گئی ہو؟ جناب مؤلف نے اپنے قیاس آرائی کا جو سبب بیان فرمایا ہے وہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے کہ حضرت معاذ نے حکم خدا و رسول کے مطابق قتل کا مطالبہ کیا تھا اور قرآن میں محض ارتداد کی سزا قتل نہیں ہے، اس لیے وہ یہودی بھی ضرور محارب تھا۔ اس لیے وہ قتل ہوا۔ یہاں پھر یہی سوال ہوتا ہے کہ محض ارتداد کے ذکر میں جس کی کوئی سزا نہیں کیا فائدہ تھا اور اصل جرم کا ذکر نہ کرنے میں جس کی سزا موت ہے، کیا مصلحت ہے؟ وہ کیسی عدالت ہے اور کیسی حماقت ہوگی۔ اگر کسی قاتل کو اس بنا پر سزا دی جائے کہ وہ پان کھاتا ہے نہ اس بنا پر کہ اس نے قتل کیا ہے۔ پھر جناب مؤلف کے اس طرزِ استدلال سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اگر حضرت معاذ خدا اور رسول کے حکم کے مطابق نہیں بلکہ محض رسول کے حکم کے مطابق کہتے تو وہ واجب القتل ہوتا۔ کیونکہ حدیث میں واجب القتل ہونے کے لیے حربی ہونے کی قید نہیں ہے یہ نتیجہ سراسر خود مؤلف کے موقف کے خلاف ہے ظاہر ہے کہ اس یہودی کے باب میں ان تمام مضحکہ خیز اور بے بنیاد قیاس آرائیوں کی بنا یہ ہے کہ فاضل مؤلف کو ایسے اسلامی حکم سے انکار ہے جس پر اجماع ہے اور جس سے انکار کی کوئی سبیل نہیں بن پڑتی۔ اس سلسلہ میں ایک نہایت حیرت انگیز انکشاف

یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ حضرت معاذ ابن جبل کا یہ فیصلہ محض ان کا ذاتی اجتہاد ہے اور بتایا ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ خواہ کوئی کتنی ہی بڑی شخصیت ہو (بجز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم) ضروری نہیں کہ اس کے اجتہاد کو ہر حال میں درست سمجھا جائے اور بحوالہ سید الشریف جرجانی یہ بتایا ہے کہ صحابہ کی ہر بات قابلِ تسلیم نہیں ہے وغیرہ بغرض مؤلف نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ کو انکی اجتہادی رائے قرار دے کر غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کوشش کا تجزیہ کیا جائے تو نہایت متضاد اور افسوسناک نتائج برآمد ہوں گے۔

تضاد بیانی کی افسوسناک مثال

مثلاً یہ کہ ابھی مؤلف نے فرمایا ہے کہ حضرت معاذ نے خدا و رسول کے ارشاد کے مطابق اس مرتد یہودی کے قتل کا مطالبہ کیا اور چونکہ قرآن میں مرتد کی سزا قتل صرف اسی صورت میں ہے جب کہ مرتد حربی ہو۔ اس لیئے ثابت ہوا کہ وہ یہودی بھی حربی تھا۔ یعنی حضرت ممدوح کا مطالبہ صحیح تھا۔

لیکن بعد میں اسے ان کا اجتہاد بتا کر ناقابلِ تسلیم قرار دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا اجتہاد صحیح نہ تھا۔ ہمیں جناب محترم مؤلفِ کتاب سے اس ناشگفتہ بیانی کی امید نہ تھی۔

پھر یہ بھی دیکھیئے کہ اس غلطی میں نہ صرف حضرت معاذ بلکہ ابو موسےٰ اشعری بھی ملوث ثابت ہوئے کہ انہوں نے محض ارتداد کی بنا پر سزا دی۔

کیا معاذ بن جبل نے اجتہادی غلطی کی؟

مزید براں یہ بھی ارشاد ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ذہن میں خدا و رسول کے واضح احکامات (یعنی جیسے احکاماتِ واضحہ جناب مؤلف کے ذہن میں اس وقت ہیں) نہ تھے۔ لیکن اس قصور میں بھی حضرت ابو موسےٰ اشعریؓ ان کے شریکِ حال ثابت ہوئے بلکہ اس وقت کے جملہ حاضرین اور قتل کرنے والے، وہ لوگ جو اس کو گرفتار کر کے لائے اور

تمام صحابہ جو اس وقت موجود تھے یا جنہوں نے بعد میں اس پر کوئی اعتراض کبھی نہیں کیا اور خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جن کے عہد مبارک میں یہ واقعہ پیش آیا اس پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا بلکہ حضرت معاذ کے باب میں حضور کا یہ ارشاد ہے کہ:۔

خذوا القرآن من اربعۃ من ابن مسعود و ابی و معاذ بن جبل و سالم

یعنی قرآن کا علم حاصل کرنا چاہو تو ان چار سے حاصل کرو۔ ابن مسعود، ابی، معاذ بن جبل اور سالم سے۔ (سیر اعلام النبلاء جزء ا ص ۳۱۶)

اور یہ حکم دیا کہ:۔

قد سن لکم معاذ ھکذا فاصنعوا (مسند احمد ص ۲۴۶)

یعنی معاذ نے جو طریق کار تمہارے لیے بنایا ویسا ہی کرو۔

نیز ارشاد نبوی ہے کہ:۔

اعلمھم بالحلال و الحرام ــــ کہ معاذ سب سے زیادہ مسائل حلال وحرام کو جانتے ہیں

اور ــــ یجیٔ معاذ یوم القیمۃ امام العلماء (سیر اعلام النبلاء)

کہ معاذ قیامت کے روز تمام علماء کے آگے آگے ہوں گے۔

اب اس کے بعد جناب مولف ہی کی یہ ہمت ہے کہ وہ حضرت معاذؓ کے فیصلہ کو مبنی بر خطا تصور فرمائیں اور ارشادِ نبوت کے علی الرغم اپنے خیال کی تائید فرمائیں دیکھیں ص ۴۳

اس سلسلہ میں مؤلف کتاب نے ایک اور شبہہ بحوالہ عینی درج فرمایا ہے کہ اس باب میں مختلف خیالات ہیں کہ اس یہودی کو موت کی سزا دی گئی یا جلا دیا گیا۔ لیکن اس سے تو اس خیال کو کوئی تقویت نہیں پہنچتی کہ مرتد کی سزا موت نہیں ہے۔

دو مرتدہ عورتوں کے قتل کا حکم

مؤلف کتاب نے قتل مرتد کے باب میں ان دو احادیث کو بھی نقل فرمایا ہے جو حضرت عائشہؓ اور جابر بن عبداللہ سے مروی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو جو مرتد ہو گئی تھی

قتل کا حکم دیا۔ فاضل مؤلف کتاب کہتے ہیں کہ اس حدیث کے سلسلۂ رواۃ میں بعض اشخاص کو محدثین نے قابل اعتبار نہیں جانا۔ اس لیے حدیث مشکوک ہے اور اس سے حکم قتل مرتد ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک اور حدیث ہے جس میں ایک عورت ام مروان کے قتل کا حکم ہے کیوں کہ وہ مرتد ہو گئی تھی اس کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے سلسلۂ رواۃ میں ایک شخص کی بات کو ناقابل یقین قرار دیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس کے باوجود آخر محدثین میں سے کون ایسا ہے جس نے اس سے قتل مرتد کا حکم اخذ نہ کیا ہو۔ تاہم جناب مؤلف نے بحوالۂ مبسوط لکھا ہے کہ اگر اس حدیث کو صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس کے قتل کا سبب یہ تھا کہ اس نے مسلمانوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا اس لیے قتل کی گئی۔ ایسا نہ کرتی تو قتل نہ کی جاتی۔ لیکن کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مردوں کے لیے بھی یہی حکم ہے؟

مقام حیرت و افسوس ہے کہ مؤلف کتاب نے حقیقت نفس الامری کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مبسوط میں یہ تمام بحث اس ضمن میں آئی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ تو سرے سے مرتدہ عورت کو مستوجب قتل نہیں سمجھتے۔ علامہ سرخسی نے اس کا ذکر وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ مرتدہ عورت کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ بعض کے نزدیک اسے قید میں رکھ کر ہر روز تازیانہ کی سزا دی جائے گی یہاں تک کہ وہ توبہ کرے یا مر جائے۔ یعنی اسے آزاد نہیں رکھا جائے گا۔ اس کے برعکس امام شافعی فرماتے ہیں کہ اسے قتل کر دیا جائے کیونکہ حضور نے جو مرتد کو قتل کا حکم دیا ہے وہ مرد اور عورت سب کے لیے عام ہے اور محض دین سے پھر جانا مستوجب قتل ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتدہ عورت ام مروان کو قتل کا حکم دیا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتدہ عورت ام قرفہ کو قتل کیا صرف اس لیے کہ اس نے ایک دین کے باطل ہونے کا اعتراف کرنے کے بعد پھر اسی باطل دین کو اختیار کیا لہٰذا مردوں کی طرح اسے بھی قتل کیا جائے گا کیوں کہ ارتداد سب سے بڑا جرم ہے اور ارتداد کا جرم کفر اصلی کے جرم سے

بڑھ کر ہے" وغیرہ (ملخصاً) مسلک شافعیہ کے نزدیک انکا دلائل کے مقابلہ میں علامہ سرخسی نے اپنے مسلک کے دلائل دیے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت صلاحیتِ جنگجوئی سے عاری ہوتی ہے اس لیے اسے قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ رہا یہ سوال کہ ان مرتدہ عورتوں کو کیوں قتل کیا گیا۔ اس کا جواب علامہ موصوف نے یہ دیا ہے کہ انہیں مرتد ہونے کی بنا پر قتل نہیں کیا گیا بلکہ قتل و فساد کے عملی اقدامات کی بنا پر کیا گیا ورنہ امام موصوف مرتدہ کو واجب القتل قرار نہیں دیتے بلکہ اسے مسلسل سخت قید میں رکھنے کا حکم دیتے ہیں۔

اس تمام بحث پر یک جائی نظر ڈالنے سے جناب مؤلف کتاب کے علی الرغم مرتد کے واجب القتل ہونے کی دلیل ہاتھ آتی ہے۔ کیونکہ اس حکم میں بتایا گیا ہے کہ مرتدہ عورت اس حال میں واجب القتل ہے جبکہ وہ آمادۂ حرب و فساد ہو لیکن مرتد مردوں کے متعلق وہی حکم ہے کہ وہ آمادۂ حرب و فساد ہوں یا نہ ہوں انہیں ہر حال میں قتل کیا جاسکتے۔ اس کے بعد علامہ سرخسی نے بدلائل قتل مرتد کے مصالح بیان فرماتے ہیں۔ غرض علامہ سرخسی کی کسی تصریح سے یہ نتیجہ اخذ فرمانا کہ مرتد سرے سے مستوجب سزائے موت نہیں ہے، توجیہ القول بمالا یرضیٰ قائلہ (یا الزام تھوپنے) کے برابر ہے۔

مؤلف کتاب کا کہنا یہ ہے کہ اگر مرتدہ عورت کو عدم صلاحیتِ حرب کی بنا پر قتل سے بری رکھا گیا ہے تو ایسے مرد کو بھی جو حرب و فساد سے کنارہ کش رہے، قتل نہ کرنا چاہیے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا یہ حکم ایسا ہی ہے جیسے ایامِ حرب میں عورتوں، ضعیفوں، بچوں دیوانوں اور مریضوں کو قتل سے منع کیا گیا ہے۔ پھر بھی چونکہ جرمِ ارتداد ان جرائم میں سب سے بڑا تھا اس لیے اسلام نے مرتدہ عورت کو اگرچہ قتل سے منع فرمایا ہے لیکن ان کو آزاد چھوڑ دینے کی اجازت بھی نہیں دی بلکہ قید بامشقت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور یہ قید کا حکم صرف عورتوں کے لیے نہیں ہے بلکہ مرتد مرد کو بھی دورانِ استتابہ قید میں رکھنے کا

حکم ہے۔ جناب مؤلف نہ جانے کیوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مرتد کو اسلامی مملکت میں آزاد چھوڑا جا سکتا ہے حالانکہ اسلام کے نزدیک ارتداد ایسا جرم ہے جس میں معافی کا امکان نہیں تا آنکہ کوئی شخص توبہ نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مرتدہ عورت کو اگر قتل بھی کر دیا جائے تو اہل تحقیق کے نزدیک قاتل سے باز پرس نہ کی جائے گی جیسا کہ کتب فقہ میں مذکور ہے۔

علامہ مرغینانی پر الزام

ہمارے فاضل مؤلف کو صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی کا یہ فیصلہ بہت پسند آیا جو انہوں نے بایں الفاظ نقل فرمایا ہے کہ:

"ہمارے لیے خدا کا یہ حکم ہے کہ مشرکین کو قتل کر دو۔ اس میں کوئی قید توبہ وغیرہ کے لیے مہلت دینے کی نہیں ہے نیز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے ایمان سے پلٹ جاتا ہے اسے قتل کر دو کیوں کہ وہ کافر حربی ہے۔" صفحہ ۹۳

مقام حیرت ہے کہ جناب مؤلف علامہ مرغینانی کی واضح عبارت نہ سمجھ سکے۔ وہ تو فرماتے ہیں کہ ہر مرتد واجب القتل ہے کیونکہ وہ کافر حربی ہی کی طرح ہے۔ گویا ارتداد بجائے خود ان کے نزدیک حرب ہے۔ ہر ذی علم اس کا یہی مطلب تصور کرے گا۔ چنانچہ علامہ بابرتی صاحب عینی، شارح ہدایہ لکھتے ہیں کہ:

لانه کافر حربی بیانه انه کافر حربی لا محالة ولیس مستامن لانه لم یطلب الامان ولا ذمی لانه لم تقبل منه الجزیة فکان حربیا

یعنی مرتد کو کافر حربی کہنے کی توضیح یہ ہے کہ اس کو ہر حال حربی ہی کہا جائے گا کیونکہ وہ مستامن نہیں ہے کہ اس نے دباہر سے آکر دارالاسلام میں) پناہ نہیں لی نہ اس نے پناہ لینے کی خواہش کی اور وہ ذمی بھی نہیں۔ کیونکہ اس سے جزیہ نہیں لیا جاتا تو اب سوائے کافر حربی کے اسے اور کیا

کہا جاتا ہے ؟

اگر جناب مؤلف شرح عینی دیکھ لیتے تو یہ بودا استدلال نہ فرماتے۔

ایک بار ان کو پھر یہ حقیقت پیش نظر رکھنے کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لیے کافر اصلی اور مرتد کو ایک ہی حیثیت میں خیال نہ فرمائیں۔ مرتد بہر حال کافر حربی ہے خواہ اسے کتنا ہی امن پسند کہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ذخیرۂ علوم میں "امن پسند مرتد" کی اصطلاح سب سے پہلے جناب مؤلف ہی نے استعمال کی۔ علاوہ اس کے علامہ مرغینانی نے اسے کافر حربی کہا ہے۔ مرتد حربی کہتے تو شاید مرتد کی دو قسمیں بنانے کے لیے کوئی وجہِ جواز نکل آتی۔ مرتد کو کافرِ حربی کہنے کا مطلب اس کے سوا نہیں کہ مرتد دوسرے امن پسند زمرۂ کفار سے خارج ہے۔

مرتد کا قتل حد شرعی ہے

حقیقت پسندانہ نگاہ اور فراستِ عامہ سے کام لیا جائے تو ثابت ہو گا کہ مرتد کے قتل کر دینے کا محض حکم ہی اس امر کی دلیل ہے کہ مرتد سے مراد جنگجو حربی نہیں ہے کیونکہ حربی کو قتل کرنے کا حکم دینا بے معنی امر ہے۔ حربی واجب القتل نہیں بلکہ واجب القتال ہے۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ مرتد کا قتل منجملہ حدود کے ہے اور یہ تعزیر ہے جس کا تعلق مدنی قوانین سے ہے اور قتال یا مقاتلہ کا حکم دفاع کے لیے ہے جس کا تعلق سیاست سے ہے۔ کسی کافر حربی کو قتل کا حکم دینا تکلیفِ مالا یطاق ہے ہاں مقاتلہ یعنی لڑنے کا حکم دیا جا سکتا ہے۔ معہذا حربی کو قتل کرنا بھی ضروری نہیں۔ وہ قیدی بھی کیا جا سکتا ہے، غلام بھی بنایا جا سکتا ہے اور بطور ایک مستامن یا ذمی کے اسے پناہ بھی دی جا سکتی ہے لیکن مرتد کو نہ غلام بنایا جا سکتا ہے نہ پناہ دی جا سکتی ہے اور نہ قیدی بنا کر رکھا جا سکتا ہے۔

لہٰذا یہ تصور ہی سرے سے باطل ہے کہ ہر حربی واجب القتل ہے۔ جناب مؤلف کتاب کے تمام دلائل اسی خود ساختہ غلط نظریہ پر مبنی ہیں جو فاضل مؤلف کتاب نے بار بار پیش فرمایا۔

ہے کہ مرتد کی دو قسمیں ہیں ۔ امن پسند اور جنگ جُو ۔ دوسری قسم کا مرتد واجب القتل ہے اور اسلام نے جن مرتدوں کو قتل کا حکم دیا ان کے نزدیک وہ سب حربی تھے ۔ باقی رہے امن پسند مرتد ۔ سو اس پوری کتاب میں کسی ایک امن پسند مرتد کا ذکر نہیں ہے جسے ارتداد کے باوجود معاف کر دیا گیا ہو ۔ غرض مرتد کے واجب القتل ہونے کا کتاب و سنت میں جہاں کہیں بھی ذکر ہے اس سے مراد محض جرمِ ارتداد کی سزا ہے ۔ جس طرح حدیث میں قاتل کی سزا قتل بوجہ ارتکابِ قتلِ ناحق ہے یا زانی محصن کی سزا رجم بوجہ ارتکابِ زنا ہے بالکل اسی طرح مرتد کی سزا بوجہ ارتکابِ ارتداد ہے ۔ قتلِ مرتد کے معنے لغۃً ، اصطلاحاً ، شرعاً ، دیانۃً ، عقلاً اور عملاً اس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتے ۔ اس کے ساتھ حربی ہونے کی شرط ناموزوں ، ناممکن اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کے خلاف ہے ۔

جرمِ ارتداد کی شدت

جرمِ ارتداد کی سنجیدگی و شدت کا ثبوت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث متعلق ابن سرح سے بھی ہوتی ہے ۔

جناب مؤلفِ کتاب نے اس حدیث کو بھی انوکھی تاویل و تعبیر کا ہدف بناڈالا ہے ۔ اس واقعہ کا خلاصہ جو روایت حضرت عبداللہ بن عباس و روایت حضرت سعد بن وقاص میں مذکور ہے یہ ہے کہ

عبداللہ بن سرح کا واقعہ

ایک شخص عبداللہ بن سرح بارگاہِ رسالت کی منشی گری ترک کر کے کفار سے جا ملا تھا ۔ اس پر اسے حضورؐ نے قتل کرنے کا حکم دیا ۔ فتح مکہ کے روز اس نے حضرت عباس کے پاس پناہ لی ۔ حضرت ممدوح اسے حضورؐ کی خدمت میں لے آئے اور درخواست کی کہ اس کی بیعت قبول فرمائی جائے ۔ حضورؐ نے اس کی طرف دیکھا اور خاموش رہے ۔ دوسری بار درخواست پر بھی آپ چپ رہے ۔ تیسری بار کی درخواست پر آپؐ نے

اس کی بیعت قبول فرمائی۔ تاہم سب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے جب اس کی بیعت سے ہاتھ روک لیا تھا تو کیا تم میں سے کوئی مردِ رشید ایسا نہ تھا جو اسے قتل کر دیتا۔ لوگوں نے کہا کہ حضورؐ نے اس کا اشارہ فرما دیا ہوتا۔ فرمایا آنکھ کی خیانت ایک نبی کی شان کے شایان نہیں ہے۔

علمائے محدثین نے اس حدیث کی مختلف زاویہ ہائے نظر سے تشریح و تنقیح فرمائی ہے۔ اس حدیث میں حضور کا بیعت سے توقف فرمانا اور پھر بیعت لینا محلِ فکر ہے لیکن یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے حضور کا تامل اشارۂ غیبی کے انتظار میں ہو.......... یہ محل اس بحث کا متحمل نہیں ہے لیکن جس امر پر سب کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ حضور نے ابن سرح کو جو مرتد ہو کر کفار سے جا ملا تھا قتل کا حکم دے دیا تھا۔ لیکن اس نے توبہ کر لی پھر مسلمان ہو گیا اور معاف کر دیا گیا۔

یہ نیازمند اس امر کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ آخر اس حدیث سے اس موقف کو کیا تقویت پہنچتی ہے کہ مرتد کی سزا قتل نہیں ہے۔ بظاہر مؤلفِ کتاب کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ اس کے لیے قتل کی سزا ارتداد کی پاداش میں تجویز نہیں فرمائی گئی تھی بلکہ وہ ایک سیاسی مجرم کی حیثیت سے پیش ہوا تھا اس لیے موجبِ قتل قرار دیا گیا تھا۔ یہاں تک تو خیر تسلیم کر لیجئے لیکن اس کے لیے جو دلیل پیش فرمائی گئی ہے وہ نہایت دلچسپ ہے، ارشاد ہے کہ:-

> "اگر وہ محض ارتداد کی وجہ سے حدِ شرعی (قتل) کا مستوجب ہوتا تو حضرت عثمان اسے پناہ نہ دیتے۔ حضرت عثمان کا پناہ دینا ایک زبردست ثبوت اس بات کا ہے کہ محض مرتد ہونے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے واجب القتل قرار نہیں دیا تھا بلکہ مشرکوں کے ساتھ ملنے اور ان کی حوصلہ افزائی کے باعث یہ حکم دیا تھا۔"

راقم الحروف اس عبارت کا مدعا سمجھنے سے قاصر ہے کہ اگر اس کو واجب القتل بوجہ ارتداد کے قرار دیا جاتا تو حضرت عثمان پناہ نہ دیتے لیکن اسے تو مشرکین سے مل جانے اور ان کی حوصلہ افزائی دنیز کلام الٰہی میں تحریف اور وحیِ الٰہی پر تمسخر کرنے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واجب القتل قرار دیا تھا۔ اس وجہ سے حضرت عثمان نے پناہ دی

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

آخر اس میں کیا تک ہے کہ مؤلفِ کتاب کے نزدیک مرتد کو پناہ دینا تو ناقابلِ فہم ہے لیکن جسے حضور نے واجب القتل قرار دیا ہو اسے پناہ دینا قابلِ فہم ہے۔

پھر اس طولِ کلام سے بھی آخر یہ نتیجہ کیسے نکلا کہ مرتد واجب القتل نہیں ہے۔

تاویل کی زحمت

حقیقت یہ ہے کہ جناب مؤلف نے شریعتِ اسلامیہ کے نہایت واضح احکامات کی منفی تاویل و تعبیر میں بڑی زحمت اٹھائی اگر وہ مسٹر پرویز کی راہ اختیار فرماتے ہوئے یہ کہہ دیتے کہ ہم حدیث وفقہ کے قائل ہی نہیں ہیں بس قرآن سے جو کچھ ہم نے سمجھا صرف وہی بات صحیح ہے باقی سب غلط ہے" تو یہ دشواریاں پیش نہ آتیں جو جناب مؤلف کو پیش آئیں انہوں نے ان دشواریوں کا جس طرح مردانہ وار مقابلہ کیا وہ حیرت انگیز ہے لیکن اب بھی وہ نہ بتا سکے کہ ملتِ اسلامیہ کے لاکھوں کروڑوں اذہان و افکار میں آخر وہ کونسی خرابی یا ذاتی اور قومی اغراض تھیں کہ وہ اتنا بھی نہ سمجھ سکے کہ مرتد امن پسند بھی ہو سکتا ہے اور محض ارتداد کی بنا پر واجب القتل نہیں ہے جب تک کہ وہ حربی نہ ہو جائے۔ خوش قسمتی سے اس تمام کتاب میں کسی ایسے ایک مرتد کی بھی نشاندہی نہیں کی گئی جسے ہم مؤلف کی اصطلاح میں امن پسند مرتد کہہ سکیں اور جن کو ارتداد پر قائم رہنے کے باوجود قتل نہ کیا گیا ہو۔

ابن سرح کا واقعہ

مؤلف نے اس حدیث متعلقہ ابن سرح کی مزید تحقیق کے سلسلہ میں فرمایا ہے کہ

ابن ابی سرح کی طرح دس بارہ اشخاص اور بھی مستوجب قتل قرار دیئے گئے تھے مگر لیکن وہ سب کے سب ایسے تھے جنہوں نے مسلمانوں پر مظالم ڈھائے یا ان کے خلاف جنگ کی تھی اس لیے انہیں مستوجب قتل قرار دیا گیا تھا۔ آگے فرمایا ہے کہ ان میں سے صرف چار کو قتل کیا گیا اور باقی مجرموں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاف فرما دیا۔ اس تحقیق کے بعد کاش وہ یہ بھی فرما دیتے کہ انہیں کس حسنِ کارکردگی کے صلہ میں معاف فرمایا اور جنہیں قتل کیا گیا ان کا جرم ایسا کون سا ناقابل معافی تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ مؤلف کو اس کا علم نہ ہو۔ شاید کسی مصلحت سے انہوں نے بیان کرنا نہیں چاہا۔ لیکن علامہ شبلی نے ان کی تفصیل (بحوالہ زرقانی ابن ہشام) یوں بتائی ہے ——————— (اواخر بیان فتح مکہ)

"عام روایت کی رو سے جن دس شخصوں کی سزائے موت کا اعلان کیا گیا تھا ان کا حال یہ ہے کہ وہ شدید مجرم تھے تاہم سات اشخاص خلوص سے ایمان لائے اور ان کو معافی دے دی گئی۔ صرف چار اشخاص قتل ہوئے تین مرد اور ایک عورت۔ عبداللہ ابن خطل، مقیس بن صبابہ، حویرث بن نقید اور ابن خطل کی لونڈی قریبہ"

اس عبارت سے واضح ہے کہ چار کے سوا تمام کے معاف کرنے کا سبب یہ تھا کہ وہ مسلمان ہو گئے تھے باقی چار کے قتل کا موجب یہ بتایا گیا ہے کہ:

"ابن خطل اور ابن صبابہ دونوں خونی مجرم تھے۔ ابن خطل جو اسلام لا چکا تھا اپنے ایک مسلمان خادم کو قتل کر کے مرتد ہو گیا تھا اور حویرث نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیوں کو اونٹ سے گرا دینا چاہا تھا۔ حضرت علی ابن ابی طالب نے اسے قتل کر دیا۔ قریبہ ابن خطل کی لونڈی مکہ کی ایک مغنیہ تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں گیت گایا کرتی تھی"

اس بارے میں متعدد روایات ہیں جن میں اختلافات ہیں اور جس کے قتل پر سب

کا اتفاق ہے وہ صرف ابن خطل تھا چنانچہ صحیح بخاری میں ابن خطل کے سوا اور کسی کے قتل کا ذکر نہیں ہے (بخاری باب فتح مکہ) یہ شخص مرتد بھی تھا اور قاتل بھی لیکن حضورؐ نے بعض قاتلوں کو بھی مسلمان ہونے کے بعد معاف فرما دیا تھا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ابن خطل کے قتل کا صرف ایک ہی سبب تھا اور وہ اس کا مرتد ہونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض محدثین نے اس کا ذکر باب قتل المرتد میں کیا ہے۔ غرض مؤلفِ کتاب کا یہ دعویٰ کہ محض جرمِ ارتداد مستوجبِ قتل نہیں ہے، اس لمبی چوڑی بحث سے بھی ثابت نہیں ہوتا، اگر ان اشخاص میں سے جن کو حضور نے فتح مکہ کے روز معاف کر دیا تھا ایک متنفس بھی ایسا ہوتا جو مرتدِ امن پسند کی جدید اصطلاح کے مطابق قابلِ درگزر ہوتا تو شاید کوئی سبیلِ تاویل و تعبیر نکل آتی۔ مؤلفِ کتاب نے موت کے سزاوار اشخاص میں سے صرف تین ایسے اشخاص کے نام بتائے ہیں جو مرتد ہو گئے تھے۔ ایک ابن سرح جو مسلمان ہو گئے تھے اور حضرت عثمانؓ کی سفارش سے معاف کر دیے گئے۔ دوسرا مقیس ابن صبابہ جس کو فتح مکہ کے روز عبداللہ بن کلبی نے قتل کر دیا۔ تیسرا ابن خطل جسے حضور کے حکم سے قتل کیا گیا۔

ابنِ سرح کی بیعت کے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تذبذب اس امر کی دلیل ہے کہ بعض مرتد باوجود توبہ کے بھی قتل کیے جا سکتے ہیں۔ اسی بنا پر فقہاء کے نزدیک کسی مرتد کو استتابہ سے پہلے ہی قتل کر دیا جائے تو اس کے قاتل سے بازپرس نہیں کی جا سکتی۔

مقیس ابن صبابہ مرتد بھی تھا اور قاتل بھی لیکن اس کا قتل سرکشی کے باعث ہوا اور خطل کو محض ارتداد کی بنا پر قتل کیا گیا جیسا کہ اوپر بتایا گیا۔

غرض اس سے جو نتائج اخذ کیے گئے وہ فقہاء کے استنباطات کے عین مطابق ہیں کہ مرتد واجب القتل ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ لیجیے کہ ان مرتدین میں سے کوئی امن پسند نہ تھا اس لیے قتل کیے گئے۔ لیکن اگر کسی امن پسند مرتد کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی تو ہم

اس نتیجے سے اتفاق کرنے پر مجبور ہیں کہ ارتداد کا جرم بجائے خود امن پسندی کے منافی ہے۔ اگر کسی معاشرہ میں کوئی مسلمان مرتد ہو کر بھی فتنہ برپا نہ کرے تو یقیناً یہ مجبوری کی بنا پر ہوگا ورنہ مرتد شخص ایک لمحہ کے لیے بھی اسلام کے ساتھ مصالحانہ رویہ اختیار نہیں کر سکتا۔ یہ صورتحال حکم قتل مرتد کی مؤید ہے اس کے منافی نہیں ہے۔

قبیلہ عکل کے واجب القتل اشخاص

اسی طرح کا واقعہ قبیلہ عکل کے ان لوگوں کا ہے جو جرائم ارتداد، بے رحمانہ قتل اور چوری کے الزام میں گرفتار ہو کر بارگاہ نبوت میں حاضر کیے گئے۔ ان کے لیے اسی بے رحمی کے ساتھ قتل کا حکم ہوا۔

مولف کتاب کا ارشاد ہے کہ ان کو محض ارتداد کے جرم میں نہیں قتل کیا گیا بلکہ قتل اور سرقہ کے جرم کی پاداش میں ایسا ہوا لیکن اس سے یہ تو نہیں ثابت ہوتا کہ مرتد قابلِ تعزیر نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اسلام سے پھر جانے ہی کے باعث ان لوگوں کو ان سخت جرائم کے ارتکاب کی دلیری ہوئی۔ جن اصحاب نے اس کو قتلِ مرتد کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے ان کا مقصد یہ ہے کہ اگر وہ مسلمان ہو جاتے تو عجب نہیں کہ انہیں معاف کر دیا جاتا گویا اصل سبب ان کے قتل کا مرتد ہو جانا ہے۔

حضرت معاذ کو مرتد کے قتل کا حکم

ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل کی تعیناتی یمن میں فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم کو جہاں کہیں بھی کوئی مرتد (دینِ اسلام سے پھر جانے والا) مرد یا عورت ہاتھ لگے اسے قتل کر دینا۔ مؤلفِ کتاب کا ارشاد ہے کہ اس حدیث کے اسناد ضعیف ہیں۔ ممکن ہے اس کے اسناد ضعیف ہوں لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اگر کوئی مرتد ہو تو اسے کچھ نہ کہا جائے۔

ایک عورت کا جرم ارتداد میں قتل: اسی طرح سنن ابی داؤد کی ایک اور حدیث کا ذکر

فرمایا ہے کہ ایک عورت جو حضور کو برا بھلا کہتی تھی (یعنی مرتد ہو گئی تھی) اسے ایک صحابی نے قتل کر دیا اور اس صحابی کو قتل کی پاداش میں سزا نہیں دی گئی۔ اس کو بھی جناب مؤلف نے ضعیف ثابت کیا ہے۔ تاہم وہ فرماتے ہیں کہ اسے سخت اشتعال انگیز حرکات کی بنا پر قتل کیا گیا تھا۔ گویا اشتعال انگیزی اسلام میں مستوجب سزائے قتل ہے۔ لیکن وہ یہ بتانے سے قاصر رہے ہے کہ اشتعال انگیزی کو قرآن حکیم یا حدیث نے کہاں جرمِ مستوجب سزائے قتل قرار دیا ہے۔

اس سے دلچسپ تر بات یہ ہے کہ اگر اس کے قاتل کو حضورؐ نے نظر انداز کر دیا تو اس سے اس خیال کو کوئی تقویت نہیں پہنچتی کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس سے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ مرتد مستوجب قتل نہیں ہے۔ مؤلف فاضل اس امر پر روشنی نہیں ڈالی کہ آخر اس عورت کے قاتل سے کوئی باز پرس نہ ہونے کا کیا سبب ہے؟ دراں حالیکہ وہ صحابی خون ناحق کے مرتکب ہوئے۔

گستاخی کی سزا قتل نہیں ہے

اسی طرح ایک واقعہ یہ بھی بیان فرمایا کہ ایک یہودی نے (السلام علیکم کی بجائے) حضور کو السام علیکم کہا جو بددعا ہے۔ اس پر صحابہ نے اسے قتل کرنے کی اجازت مانگی۔ آپ نے منع فرمایا۔ لیکن اس حدیث کو مرتد کے احکام سے کیا تعلق؟ وہ شخص تو یہودی تھا۔ اس طرح کی بے شمار باتیں ہیں جن سے کتاب کا حجم تو بڑھ گیا لیکن یہ کسی طرح ثابت نہ ہو سکا کہ مرتد قتل کا مستوجب نہیں ہے۔

مؤلفِ کتاب نے اپنے خیال کی تائید میں ایک دلچسپ حدیث پیش کی ہے خلاصہ مختصراً اس کا یہ ہے کہ ایک بدو نے حضور سے بیعت کی۔ اتفاقاً اسے بخار ہو گیا (شاید وہ سمجھا کہ اسی بیعت کی وجہ سے بخار ہوا) اس لیے وہ خدمت اقدس میں آیا اور فسخ بیعت کی تین بار درخواست کی اور آپ نے ہر بار انکار فرمایا۔ پھر وہ چلا گیا۔ فاضل مؤلف اس سے یہ سمجھے ہیں کہ وہ مرتد ہو گیا تھا اور پھر بھی اسے قتل نہ کیا گیا۔ حالانکہ اس حدیث کے آخر میں یہ بتایا گیا

ہے کہ جب وہ (بغیر فسخ بیعت کیے) چلا گیا تو حضور نے فرمایا کہ "مدینہ آگ کی بھٹی کی طرح ہے کہ غلاظت اور کثافت کو دور کر کے پاکیزگی کو باقی رکھتا ہے"۔ یہ فقرہ صاف اس کی وضاحت کرتا ہے کہ اس شخص کے دل میں جو کثافت تھی وہ دور ہو گئی اور وہ بدستور بیعت میں رہا، مرتد ہی نہیں ہوا اور جب یہ صورت حال ہے تو اس کی تعزیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا ذہن اس امر کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ آخر اس حدیث میں وہ کونسا پہلو ہے جو فاضل مؤلف کتاب کے اس دعوٰے کی تائید کرتا ہے کہ مرتد واجب القتل نہیں ہے۔ اس بیچارے بدو پر مرتد ہونے کا غلط الزام لگا دینے سے تو یہ مقصد حل نہیں ہو سکتا۔ واضح ہو کہ بخاریؒ نے اس سلسلہ میں چند اور احادیث کا ذکر فرمایا ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ دنیوی فائدے کے لیے بیعت کرتے ہیں وہ فلاح کو نہیں پہنچتے۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ ایک اور دلیل سنیئے جس سے مؤلف نے اپنے موقف کی تائید فرمائی ہے

صلح نامہ حدیبیہ سے استدلال

صلح حدیبیہ میں جو معاہدہ طے پایا تھا اس کی ایک دفعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی اہل مکہ مسلمان ہو کر مدینہ آ جائے تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اسے واپس مکہ بھیج دیں گے لیکن اس کے برعکس اگر مسلمان مرتد ہو کر مکہ میں پناہ لے ___ تو قریش واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔

اس سے مؤلف کتاب نے یہ دلچسپ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر کوئی مرتد فی الواقع سزائے موت کا مستوجب ہوتا تو اس کے لیے یہ شرط ہرگز منظور نہ کی جاتی بلکہ تاکیدی شرط ہوتی کہ اسے واپس بھیج دیا جائے تاکہ مسلمان اس مرتد کو قتل کر دیں۔

پس اس سے ثابت ہوا کہ اسلام میں قتلِ مرتد کی اجازت نہیں۔ حیران ہوں کہ آخر اس دلیل کی کون سی کل ٹھیک ہے۔ شرط کے دونوں اجزاء پر ایک نظر ڈالنے ہی سے ظاہر ہوتا

ہے کہ اہل مکہ کے نزدیک مسلمان ہونا مستوجب قتل نہ تھا لیکن مسلمان کا کفر اختیار کر لینا قتل کا مستوجب ہے۔ اسی لیے شرط کے پہلے حصہ میں کافر کے مسلمان ہو کر مدینہ میں آجانے کا ذکر ہے اور دوسرے حصہ میں مسلمان کے کافر ہو کر مکہ میں پناہ لینے کا ذکر ہے۔ پناہ لینے کے الفاظ پہلی شق میں نہیں ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی مسلمان مرتد ہونے کے بعد صرف کافروں کی پناہ میں زندہ رہ سکتا ہے۔ اسلام میں اس کی سزا قتل ہے غرض اس معاہدے کے الفاظ سے باقتضاء النص ظاہر ہوتا ہے کہ مرتد کو اسلامی نظام میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

ایک اور دلچسپ دلیل

مؤلف کتاب کے دلچسپ دلائل کے سلسلہ میں ایک دلیل یہ بھی ہے کہ قبیلہ لخم کے ساتھ معاہدہ امن کی دستاویز میں ارشاد ہے کہ ان میں سے جو مسلمان ہو جائے اور احکام دین بجا لانے لگے اور مشرکین سے رابطہ اتحاد منقطع کرے تو خدا اور رسول اس کی جان و مال کے محافظ رہیں گے لیکن اگر کوئی مسلمان ہونے کے بعد اسلام سے پھر جائے گا تو خدا اور رسول اس کی جان و مال کے تحفظ کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا اور رسول کے نزدیک صرف اس کی جان و مال دونوں کی کوئی قدر نہیں (یعنی اسے قتل کا حکم نہیں ہے۔)

اس معاہدہ کے مدعا کو سمجھنے میں کوئی پیچیدگی نہ ہونی چاہیے تھی لیکن جناب مؤلف کا ارشاد ہے کہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مرتد کی سزا قتل ہے بلکہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی جان و مال محفوظ نہ رہے گی۔ مؤلف کتاب نے اس سے یہ نتیجہ اخذ فرمایا ہے کہ اسے قتل نہ کیا جائے صرف اتنی سی بات ہے کہ اس کی جان محفوظ نہ ہوگی۔ لہذا ثابت ہوا کہ مرتد مستوجب سزائے موت نہیں ہے۔ حالانکہ جان و مال کے تحفظ کی ضمانت سے دست برداری کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ قتل کر دیا جائے گا بلکہ کوئی شخص بھی اسے قتل کر دے

تو باز پرس نہ ہوگی یہ تو سزائے قتل سے بھی زیادہ خطرناک صورتِ حال ہے۔

مکالمۂ ابوسفیان و ہرقل سے استدلال

اسی طرح مؤلفِ کتاب نے ابوسفیان اور ہرقل کے مکالمہ کو اپنے خیال کی تائید تصور فرمایا ہے ۸۱-۸۲ دلیل کا مرکز یہ ہے کہ ہرقل نے ابوسفیان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دریافت کیا کہ:

"کیا ان کے متبعین ان سے محبت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ رہتے ہیں یا ان سے پھر جاتے ہیں اور ساتھ چھوڑ دیتے ہیں" (ترجمہ الکامل ابن اثیر)

ابوسفیان کہتے ہیں کہ:

"میں نے کہا کہ جو بھی ان کا پیرو ہوا ہے کبھی اس نے ان کو نہیں چھوڑا"

اب کیا اس عبارت سے کسی طرح بھی یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ مرتد مستوجب سزائے موت نہیں ہے تاہم مؤلفِ کتاب کی فراست قابلِ داد ہے کہ وہ اس کو بھی ایک دلیل تصور فرماتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر مرتد کی سزا قتل ہوتی تو ابوسفیان کہتے کہ جناب ان سے کوئی پھر کیسے سکتا تھا وہ تو پھر جانے والے کو قتل کر دیتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ سوال یہ نہیں تھا کہ حضورؐ کے متبعین ان کا ساتھ کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ ایسا سوال ہوتا تو شاید ابوسفیان وہی جواب دیتے جو مؤلفِ کتاب کے ذہن میں ہے۔ مؤلفِ کتاب کا کہنا شاید یہ ہے کہ اگر ابوسفیان سوال سے قطع نظر بے تعلق جواب دیتے تو ثابت ہو جاتا کہ مرتد مجرم ہے۔ چونکہ انہوں نے صحیح جواب دیا اس لیے ثابت ہوا کہ مرتد مستوجبِ قتل نہیں ہے۔

اس قسم کے استدلالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب مؤلف کو ملتِ اسلامیہ کے لاکھوں اہلِ علم کی کوتاہ نظری ثابت کرنے کے لیے کیسی کیسی زحمتیں اٹھانی پڑی ہیں۔

ایک اور دلیل۔ تحویلِ قبلہ مؤلفِ کتاب نے ایک اور دلیل یہ دی ہے کہ تحویلِ قبلہ

کا حکم نازل ہونے پر کچھ مسلمان بھی مرتد ہو گئے تھے ص۳۶۔ مؤلف کتاب کا کہنا ہے کہ اس سلسلہ میں کسی مرتد کے قتل کیے جانے کا ذکر نہیں ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ مرتد کو قتل کا حکم نہیں ہے لیکن دلائل اس امر کے موجود ہیں کہ اول تو کوئی مسلمان مرتد نہیں ہوا یا کم از کم ارتداد پر قائم نہیں رہا۔ خود ابوسفیان اور ہرقل کی گفتگو میں جسے مؤلف کتاب نے نقل فرمایا ہے، ابوسفیان کا یہ قول موجود ہے کہ جو ان کا پیرو ہوا کبھی اس نے ان کو نہیں چھوڑا۔ ابوسفیان سے ہرقل کی یہ گفتگو ۶ھ کا واقعہ ہے اور تحویلِ قبلہ ۲ھ میں ہوا۔ گویا اس دوران کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اسلام کے بعد مرتد رہا ہو۔ تعجب ہے کہ اس واقعہ کو مؤلف کتاب نے کس طرح اپنے خیال کی تائید میں پیش فرمایا۔ ص۹۲

واقعہ معراج سے استدلال

اسی طرح معراج کے واقعہ کے سلسلہ میں جو ہجرت سے پہلے کا ہے، مؤلف نے بتایا ہے کہ بعض لوگ واقعۂ معراج کی تفصیل سن کر مرتد ہو گئے لیکن کسی کے قتل کا ذکر نہیں ہے تاہم وہ تسلیم فرماتے ہیں کہ وہ تمام مرتدین ابوجہل کے ساتھ جنگ بدر میں قتل ہو گئے مؤلف کا کہنا یہ ہے کہ ان پر ارتداد کی کوئی فردِ جرم عائد نہیں کی گئی یعنی لڑائی میں مارے جانے سے مرتد کی سزا قتل ثابت نہیں ہوتی۔

مقامِ افسوس ہے کہ مؤلفِ کتاب نے واقعہ معراج کو بھی حقائق کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ معراج ہجرت سے تین سال پہلے کا واقعہ ہے اور حضورؐ کی مکی زندگی جن خطرات اور مصائب میں گزری اس سے وہ بیخبر نہیں ہیں۔ اس دور میں اول تو مسلمانوں کی تعداد ہی بہت تھوڑی تھی، وہاں دشمنانِ اسلام مسلمانوں کی جان کے لاگو تھے۔ دینی احکامات قصاص و تعزیرات کے احکامات کا نزول بھی نہیں ہوا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک کوئی شخص مرتد ہی نہ ہوا تھا یا اگر ہوا ہو تو ارتداد پر قائم نہیں رہا۔ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۶۱ کے الفاظ میں انسانوں کی آزمائش کا ذکر ہے

مسلمانوں کی آزمائش کا ذکر نہیں ہے۔ تاہم میں مودبانہ عرض کروں گا کہ اگر بالفرض کچھ لوگ مرتد ہو گئے جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور وہ جنگِ بدر میں مارے گئے تو از خود اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ گئے۔ اگر وہ نہ مارے جاتے تو قتل کر دیے جاتے۔ اب کوئی احمق ہی یہ سوال کر سکتا ہے کہ اس سے پہلے کیوں نہ قتل کیے گئے۔ سو ظاہر ہے کہ اس وقت ان کا قتل ممکن ہی نہ تھا کیونکہ وہ دشمنوں کے ساتھ مل کر خود مسلمانوں کے قتل کی فکر میں تھے اور ان کے خلاف برسرِ پیکار تھے تو اب ایسے اشخاص کے ساتھ جنگ ہی کی جا سکتی ہے اور ایسا ہی ہوا۔ غرض مؤلفِ کتاب کا یہ تیر بھی تکا ہی ثابت ہوا۔

منافقوں سے درگزر کیے جانے سے استدلال

سورہ توبہ کی آیت ۷۴ میں بعض منافقوں کا ذکر ہے جو حضور کے خلاف کلماتِ ناشائستہ کہتے تھے۔ جب شکایت ہوئی تو قسم کھا کر مکر گئے۔ قرآن حکیم میں ان کے اس منافقانہ طرزِ عمل کا ذکر ہے۔ مؤلف کا ارشاد ہے کہ ان کو قتل نہیں کیا گیا جس سے ثابت ہوا کہ مرتد کو قتل کا حکم نہیں ہے۔ اس کا جواب اول تو ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ انجام کار انہوں نے توبہ کر لی اور اچھے مسلمان بن گئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہنوز وہ قتل نہ ہوئے تھے کہ توبہ کر کے مسلمان ہو گئے۔ توبہ نہ کرتے اور قتل نہ ہوتے تو شاید کوئی بات تھی۔ معہذا حقیقت یہ ہے کہ ان کو منافق کہا گیا ہے۔ مرتد نہیں۔ لہذا بنائے استدلال ہی باطل ہے۔

ایک عیسائی کی عبرتناک موت

مؤلفِ کتاب نے ایک اور واقعہ بحوالہ حدیث ذکر فرمایا ہے کہ ایک عیسائی مسلمان ہو کر پھر عیسائی ہو گیا تھا اور کچھ عرصہ کے بعد مر گیا اور دفن کر دیا گیا۔ اگلے روز اس کی لاش قبر کے باہر پڑی ملی۔ اسے اور گہری قبر میں دفن کیا گیا پھر بھی یہی ہوا۔ اس کے متعلقین کو شبہ تھا کہ یہ کارستانی پیغمبرِ اسلام کے پیروؤں نے کی ہے لیکن جب تیسری بار بھی وہ لاش باہر پڑی ہوئی ملی تو لوگوں نے یقین کیا کہ یہ کسی انسان کا کام نہیں ہے۔

اس واقعہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مرتد کو زمین نے بھی قبول نہ کیا۔ مسلمان اس کی موجودگی کس طرح قبول کرتے۔ بظاہر وہ شخص قتل سے بچتا رہا اور مر گیا اور چونکہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں زندگی میں کیفرِ کردار کو نہ پہنچ سکا اس لیے مرنے کے بعد اس کی لاش کو گھسیٹنا پڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی لاش باہر پھینکے جانے کے متعلق لوگوں کا یہ شبہ کرنا کہ یہ مسلمانوں کا کام ہے بجائے خود اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ لوگ جانتے تھے کہ مسلمانوں کے نزدیک مرتد ہونا کتنا بڑا جرم ہے کہ اگر کوئی سزا سے بچ بھی جائے تو مرنے کے بعد بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ فرمانا کہ مرتد مستوجب سزا نہیں ہے بجز خوش فہمی کے اور کیا ہے۔

مجاع بن مرارہ کا واقعہ

بالآخر ایک اور واقعہ مؤلف کتاب نے بحوالہ ابن اثیر درج فرمایا ہے[85] کہ سنہ ۹ھ میں ایک شخص مجاعہ بن مرارہ شاہِ یمامہ ہوزہ بن علی کے سفیر کی حیثیت میں آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور یہاں آکر مسلمان ہو گیا تھا لیکن واپس جاکر پھر مرتد ہو گیا مگر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ واضح رہے کہ یہ شخص مسیلمہ کذاب کا پیرو ہو گیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ اس کے خلاف قتل کی کارروائی کون کرتا۔ کیا وہ لوگ جو مسیلمہ کذاب کی جماعت میں شامل تھے؟ اور کیا یہ دلیل معقول ہے کہ چونکہ کافروں نے اسے قتل نہیں کیا اس لیے اسلام میں مرتد مستوجب قتل نہیں ہے پھر یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ شخص قتل سے بچا رہا جب کہ مسیلمہ کی تمام جماعت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے بموجب خلافتِ اولیٰ میں قتل کر دیا گیا تھا۔

مؤلف کتاب نے یہ واقعہ کامل ابن اثیر کے اردو ترجمہ (ص ۳۵) کے حوالہ سے درج کیا ہے۔ ماخذ کے دیکھنے سے واضح ہے کہ ہوزہ بن علی بادشاہِ یمامہ نے دو اشخاص کو حضورؐ کی خدمت میں بھیجا تھا مجاعہ بن مرارہ اور رجال بن عنفوہ۔ شاہِ یمامہ نے لکھا

تھا کہ اگر اس کو حضورؐ اپنی حکومت کا جانشین بنالیں تو وہ مسلمان ہو جائے گا۔ بصورتِ دیگر وہ جنگ کرے گا۔ اس کے بعد وہ مرگیا اور مجاعہ اور رجال دونوں مسلمان ہو گئے۔ رجال تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے لیکن مجاعہ واپس چلا گیا اور وہاں جاکر یہ اڑادی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ مسیلمہ کو شریک کر لیا ہے۔

اس تمام واقعہ کا اختصار جناب مؤلف نے کچھ اس طرح فرمایا ہے جس سے یہ غلط تاثر ہوتا ہے کہ مجاعہ بن مرارہ کو حضورؐ نے باوجود مرتد ہو جانے کے کوئی سزا نہیں دی۔ اب یہ کیسے یقین کیا جائے کہ مؤلفِ ممدوح کو یہ نہیں معلوم کہ مسیلمہ اور اس کی جماعت سب کے خلاف جہاد کیا گیا اور ان کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں اس استدلال کی گنجائش کہاں باقی رہ جاتی ہے؟

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کا غلط حوالہ

مؤلف کتاب نے ایسا ہی غلط تاثر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی ایک عبارت سے دینے کی کوشش فرمائی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ پروفیسر ہیفننگ نے تحت لفظ "مرتد" لکھا ہے کہ "ایسی احادیث موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مرتدوں کو معاف کر دیا" ص۸۵ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ حضورؐ نے کبھی مرتد کو معاف فرمایا، نہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں یہ مذکور ہے اور نہ نسائی، ابوداؤد، تفسیر طبری وغیرہ میں جس کا حوالہ دیا گیا ہے، یہ آیا ہے کہ مرتد کو معاف کیا گیا۔ اس کے برعکس انسائیکلوپیڈیا کے مضمون نگار نے بھی یہی بتایا ہے کہ اسلام میں مرتد مستوجب سزائے موت ہے اور تمام احادیث و فقہ میں بھی یہی ہے۔ البتہ سب نے یہ بتایا ہے کہ ارتداد کے بعد توبہ کرنے والے کی جان بخشی حضورؐ نے بھی فرمائی اور احادیث کا بھی یہی منشا ہے، باستثنار چند صورتوں کے جن میں خدا بھی توبہ قبول نہیں کرتا اور پیغمبر نے بھی جرم سے بری نہیں رکھا۔ ان واضح حقائق کی موجودگی میں جناب مؤلف نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اسے غلط بیانی ہی کہا جائے گا جو

افسوسناک بھی ہے اور تعجب خیز بھی۔

احادیثِ رسول اللہ تاریخ کی روشنی میں

ان تمام دلائل کے خاتمہ پر جناب مؤلف نے بڑے شد و مد سے فرمایا ہے کہ:۔

"راسخ العقیدہ یا تقلید پسند علما کی زبردست روایات کی موجودگی میں بھی اگر احادیثِ رسول اللہ کا تاریخ کی روشنی میں گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس خیال کو کوئی تقویت نہیں پہنچتی کہ اگر کوئی مسلمان دین سے پھر جائے تو وہ سزائے موت کا مستوجب ہے"

تاریخ کی روشنی میں گہری نظر سے احادیث کا مطالعہ جس طرح فاضل مؤلف نے کیا ہے وہ تفصیلِ بالا سے عیاں ہے کہ ان کے خیال کی بنیاد فرضی اور وہمی قیاسات، عدم تفقہ اور سب سے زیادہ افسوسناک امر غلط حوالہ جات پر قائم ہے۔ مؤلفِ کتاب نے اس کے برعکس یہ فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات جن پر تقلید پسند والے اپنے دلائل کی عمارت کھڑی کی ہے اس کی بنیاد اس وقت کے ماحول سے بے خبری ہے۔ لہذا چاہیئے کہ ان تمام ارشادات کو کتاب اللہ کے الفاظ اور مطالب کے مطابق مرتب کیا جائے کیونکہ حضورؐ کا کوئی اقدام احکامِ قرآنی کے خلاف نہیں ہو سکتا" ص ۸۶

علمائے اسلام کی ایک بڑی حماقت

اس کا تجزیہ کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جن لاکھوں بلکہ کروڑوں اشخاص نے ارشاداتِ نبویؐ کا جو مطلب سمجھا ہے وہ ماحول یا موجود الوقت حالات سے بے خبری کی بنا پر تھے یا انہوں نے حضورؐ کو قرآنی احکام کے خلاف اقدامات کا قصوروار ٹھہرایا اور اس الزام سے بریت کی توفیق صرف جناب ممدوح کو ہوئی۔ اس سلسلہ میں علمائے اسلام کی ایک بہت بڑی حماقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ:۔

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہر ایسا معاملہ جو بظاہر یا فی الواقع قرآن سے متصادم

جو اس کی بابت حدیث کو فیصلہ کن سمجھنا چاہیئے" چنانچہ یہ قول نقل فرمایا ہے کہ السنة قاضية على الكتاب یعنی حدیث کتاب اللہ کے بارے میں فیصلہ کرنے والی شے ہے"

قرآن و حدیث کا تصادم

اس کا حوالہ انہوں نے نہیں دیا لیکن ہر عالم دین کو اس کا اعتراف ہے کہ بلاشبہ حدیث ہی ایسی شے ہے جو کتاب اللہ کے صحیح مفہوم کو بتا سکتی ہے اور یہ ایسی اصولی غلطی ہے کہ تمام عدالت ہائے عالیہ کے محترم جج جن میں خود جناب مؤلف بھی شامل ہیں اس کے مرتکب ہوتے چلے آئے ہیں کیونکہ یہ تمام اصحاب ملکی قوانین کی بالادستی کا اعتراف کرنے کے باوجود وہی مطلب و مقصد تسلیم کرتے ہیں جس کی تصدیق عدالت ہائے عالیہ کے جج کر دیں۔ مختلف الآراء وکلاء مرافعہ قانون کی تعبیر اپنے اپنے نقطۂ نظر سے کرتے ہیں لیکن صحیح تعبیر وہی سمجھی جاتی ہے جو چیف جسٹس نے کی ہو اس کے خلاف ہر تعبیر بجا اس کے مترادف ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے علمائے اسلام بھی قرآن کا وہی مطلب درست سمجھتے ہیں جس کی تائید احادیث سے ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص احادیث کے فیصلہ کو غلط قرار دے کر اس کے خلاف کوئی مطلب بیان کرتا ہے تو اس کو نہ صرف یہ کہ رد کر دینا چاہیئے بلکہ مستوجب تعزیر قرار دینا لازم ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی ملکی قانون کی وہ تعبیر جس کی تائید عدالت ہائے عالیہ کے فیصلے نہ کرتے ہوں قابل رد و انکار ہے اور اس پر اصرار کرنے والا توہین عدالت کا مجرم ہے۔ "السنة قاضية على كتاب الله" کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں ہے اور نہ کوئی اور مفہوم اس کا ممکن ہے نہ کسی نے اس کے خلاف کچھ اور مطلب سمجھا۔

عہد حاضر کے بعض احمقوں نے یہ الزام لگایا ہے کہ "علماء کہتے ہیں کہ جو کچھ حدیث میں ہے وہ مانو اور قرآن اس کے خلاف ہو تو رد کر دو" حالانکہ علماء کہتے ہیں کہ حدیث

کبھی قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتی لہٰذا قرآن کا مطلب من مانا مت کرو بلکہ احادیث کی روشنی میں کرو۔ لہٰذا نہایت دکھ کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ مؤلف کتاب کا یہ ارشاد کہ علمائے اسلام کے بعض قدیم و جدید اذہان اس کو قرآن حکیم کی ازلی صداقت کے منافی خیال کرتے ہیں قطعاً بے بنیاد ہے۔ اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس کے برعکس حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے لے کر آج تک ملت اسلامیہ کے جس قدر علماء گزرے ہیں سب نے قرآنی مطالب کی تصدیق و تائید کے لیے صرف سنت ہی کو قاضی (یا فیصلہ کن) قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین نے کتاب اللہ کے احکام کی بجا آوری کے لیے احادیث رسول اللہ کی توضیحات سے مدد لی ہے اور ان کو مشعل راہ بنایا ہے۔

(۳)

مؤلف کتاب نے خلفائے راشدین کے فیصلوں کے باب میں بھی توجیہ و تعبیر و تاویل کی وہی روش اختیار فرمائی ہے جو احادیث کے بارے میں ہے۔

ام فرقہ کا قتل

تعامل خلفائے راشدین کے سلسلہ میں سب سے پہلے ایک عورت ام فرقہ کا ذکر کیا ہے مثلاً جسے حضرت ابوبکرؓ نے قتل کا حکم دیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسے مرتدہ ہونے کی وجہ سے قتل نہیں کیا گیا بلکہ وہ محاربہ تھی۔ ممکن ہے کہ وہ محاربہ نہ ہوتی تو قتل نہ کی جاتی لیکن اس لیے نہیں کہ مرتد مستوجب قتل نہیں بلکہ اس لیے کہ عورت مرتدہ کو قتل کا حکم نہیں ہے صرف قید بامشقت کا حکم ہے۔ لہٰذا یہ دلیل قیاس مع الفارق ہے، یہاں منطبق نہیں ہوتی۔

اسود عنسی کا واقعہ

اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے اس حکم کا ذکر ہے جس میں آپ نے مرتدین کو قتل کا حکم دیا تھا۔ ان قبائل میں سے ایک قبیلہ بنو مذحج تھا جس کا سردار یمن میں اسود عنسی مدعی نبوت تھا یہ شخص اہل یمن کے ساتھ مسلمان ہو گیا لیکن بعد میں مرتد ہو گیا تھا۔ اسلام کا سب سے پہلا مرتد یہی

شخص تھا۔ رسول اللہ کے تحریری فرمان کے مطابق ۱۱ھ میں اسے قتل کر دیا گیا اس نے مسلمانوں کو کافی نقصان پہنچایا اور بعض علاقوں پر قابض ہو گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل وغیرہ کو حکم دیا تھا کہ اس پر حملہ کر کے اس کی تحریک (اجرائے نبوت) کا خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ اور اس کے ساتھی قتل کر دیے گئے۔ مؤلف کا کہنا ہے کہ یہ ارتداد کی بنا پر نہیں، بلکہ بغاوت کی بنا پر قتل کیے گئے۔ اس کو من وعن تسلیم کر لیجیے پھر بھی اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ مرتد مستوجب قتل نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کو صرف ارتداد کی بنا پر قتل کا حکم ہوا کیونکہ آنحضرت کے بعد ہر مدعی نبوت مرتد ہے۔

مسیلمہ کذاب کا واقعہ

ایسی ہی مثال مسیلمہ کذاب کی ہے جو قبیلہ بنو حنیفہ کا سردار اور مدعی نبوت تھا جس کے خلاف کارروائی عہد رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میں شروع ہو گئی تھی لیکن اس کی تحریک کا خاتمہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کیا گیا۔ جناب مؤلف نے یہ نہیں بتایا کہ اس واقعہ کو مرتد کے واجب القتل نہ ہونے سے کیا تعلق ہے۔ اگر مسیلمہ اور اس کے متبعین میں سے کچھ مسلمان بھی تھے اور بوجہ ادعائے نبوت یا پیروئ نبی کاذب قتل کر دیے گئے تو اس سے یہ نتیجہ کس طرح نکلا کہ مرتد مستوجب قتل نہیں ہے۔

قبیلہ بنو اسد کا ارتداد

آگے بتایا ہے کہ تیسرا قبیلہ بنو اسد طلیحہ بن خویلد اسدی کی سرکردگی میں مرتد ہو گیا اور اسلام کے خلاف صف آرا ہوا۔ اس کو بھی حضرت ابوبکر کے عہد میں خالد بن ولید کے ہاتھوں شکست ہوئی وہ بھاگ کر ملک شام چلا گیا، بعد میں مسلمان ہو گیا۔ اسی طرح ایک شخص لقیط بن یزدی بھی مسلمان ہو گیا اور نبوت کے مقام پر فائز ہونے کا دعوےٰ کیا۔ اس کے خلاف بھی اسلامی فوج بھیجی گئی۔ لیکن ان تمام واقعات سے اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو صرف یہ کہ مرتد مستوجب قتل ہے۔ یہ کہاں سے نکلا کہ مرتد واجب القتل نہیں ہے۔ مؤلف کتاب ایک نظیر بھی ایسی پیش نہ کر سکے جس سے ظاہر ہوتا کہ ان میں کوئی مرتد امن پسند بھی تھا جسے قتل نہ کیا گیا ہو۔

زیادہ سے زیادہ ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرتد کوئی بھی امن پسند نہ رہا۔ یہ امر بجائے خود حکم قتلِ مرتد کی ایک اور حکیمانہ مصلحت پر دال ہے کہ کوئی مرتد امن پسند ہو ہی نہیں سکتا ارتداد بجائے خود ایک بغاوت اور دوعملی سے سرتابی ہے۔ اس زمانہ میں اور غیر اسلامی حکومتوں میں بھی جو شخص اسلام سے پھر کر کوئی اور دین اختیار کر لیتا ہے ایسے اشخاص میں سے ایک فرد بھی ایسا نہیں ہے جو امن پسند ہو۔ بظاہر کشت وخون سے محترز رہنا بعض مجبوریوں کی بنا پر ہوتا ہے والا فی الجملہ ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف آتشِ عناد بھڑکتی رہتی ہے۔ ان کا ارتداد بذاتِ خود اس امر کی دلیل ہے کہ انہیں مذہب اسلام سے تنفر اور کفر یا غیر اسلامی عقاید و اعمال سے الفت ہے۔ مرتد کے علاوہ دوسرے غیر مسلم اشخاص اسلام کی خوبیوں سے ناواقف ہونے کے باعث حلقہ بگوشِ اسلام نہیں ہوتے اس لیے وہ قابلِ بازپرس نہیں ہیں۔ بالخصوص اس لیے کہ وہ کسی وعدہ خلافی یا غداری کے مرتکب نہیں ہوئے بخلاف مرتد کے کہ وہ اسلام سے برگشتہ ہو کر گویا ربقۂ اطاعت سے آزاد اور عہد طاعت سے غداری کا مرتکب ہوتا ہے کاش! مؤلف کتاب اس تمام کتاب میں کوئی ایک نظیر بھی ایسی پیش فرما دیتے کہ عہدِ نبوی یا عہدِ خلافت راشدہ میں کسی امن پسند مرتد کو مستوجب سزا نہ قرار دیا گیا ہو تو شاید وہ نظیر اس کتاب کے تمام دلائل سے زیادہ وزنی ہوتی۔

عیینہ بن حصن اور قرہ بن ہبیرہ

اس سلسلہ میں جناب مؤلف نے بحوالہ ترجمہ تاریخ طبری جلد ۳ (دراصل ج ۱ ہے) دو اشخاص کا ذکر فرمایا ہے ص۹۱ یعنی عیینہ بن حصن اور قرہ بن ہبیرہ کو گرفتار کر کے حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ حضرت ممدوح نے انہیں معاف کر دیا حالانکہ عیینہ کہتے ہیں کہ مجھے اس وقت تک خدا پر یقین نہ تھا اور وہ کبھی دردِ پردہ مرتد ہو گیا تھا۔

مجھے نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ اس بیان میں صریحاً حق پوشی سے کام لیا گیا ہے اصل کتاب کی عبارت یہ ہے:۔

"عیینہ بن حصن اس حالت میں کہ اس کے دونوں ہاتھ رسی سے اس کی گردن پر بندھے تھے مدینہ آیا۔ مدینہ کے لڑکے کھجور کی شاخوں سے اسے کو نچتے تھے کہ اللہ کے دشمن ایمان لانے کے بعد تو کافر ہو گیا۔ اس نے جواب دیا کہ میں آج تک اللہ پر ایمان ہی نہیں لایا تھا۔ ابو بکرؓ نے اسے بھی معاف کر کے اس کی جان بخشی کر دی۔"

اس عبارت کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ مرتد ہوا ہی نہیں تھا بلکہ وہ بطور کافر کے پیش ہوا تھا۔ کسی غلط فہمی کی بنا پر اسے ارتداد کے مجرم کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس سے مرتد کی معافی قرار دینا دوسروں کی آنکھ میں دھول ڈال دینے کے مترادف ہے۔ رہا قرہ بن ہبیرہ کا واقعہ سو وہ منافق تھا اور منافق کو قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے صرف مرتد کو قتل کا حکم ہے۔ غرض اس حالت میں کہ اس کو رسی سے باندھ کر پیش کیا گیا تھا۔ بہر حال یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ مجرم تھا یا ارتداد کا مجرم سمجھ کر پیش کیا گیا۔ فی الواقع وہ مرتد نہیں تھا۔ اندریں حالات مؤلف کا یہ ارشاد کہ ان دونوں اشخاص کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا اس سے عیاں ہے کہ مرتد کی سزا کے لیے کوئی طے شدہ سزا نہیں ہے۔ کس قدر کمزور بلکہ غلط ہے کیونکہ ان دونوں اشخاص میں سے ایک منافق تھا اور دوسرا کافر۔ ان میں کوئی مرتد تھا ہی نہیں۔ ایسا ہوتا تو خلیفہ اول اسے ہرگز معاف نہ فرماتے۔

بار بار توبہ کرنے والا مرتد

ایک اور واقعہ جو مرتدین کے باب میں خلفائے راشدین کے طرز عمل کا گواہ ہے مؤلف کتاب نے نقل فرمایا ہے ص ۹۱-۹۲ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ والی مصر حضرت عمرو بن العاص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں لکھا کہ ایک شخص نے مسلمان ہو کر کفر اختیار کیا اور پھر مسلمان ہوا اور اسی طرح کرتا رہا اور بالآخر پھر وہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ اس کے بارے میں بارگاہِ خلافت کا کیا حکم ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جتنی بار بھی وہ توبہ کرے لے

تسلیم کر لینا چاہیئے اور آخر میں اسلام پیش کیا جائے۔ اگر اس کی پیروی سے انکار کرے تو اس کی گردن ماردی جائے۔

ظاہر ہے کہ اس حکم میں تاویل کی کوئی بھی گنجائش نہ تھی تاہم فاضل مؤلف کی ذہنی کاوش نے اس میں بھی راہِ تاویل نکال لی۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اس روایت کے پہلے حصہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بار بار کا ارتداد برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے تو یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ارتداد کی حالت پر قائم رہنے کے بعد بھی مرتد قتل سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

حضرت عمرؓ کے حکم کی غلطی

اب چونکہ اس وضاحتی ارشاد میں کسی تاویل کی گنجائش نہ تھی اس لیے ناچار مؤلفِ کتاب کو خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے حکم میں خامی یا غلطی کا احساس ہوا۔ چنانچہ ان کا ارشاد ہے کہ ارافِ تنجد یدجہیز کے بارے میں ایک عورت نے حضرت عمرؓ کے فیصلہ سے اختلاف کیا تھا۔ اسی طرح ان کی رائے ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ کو بھی رد کیا جا سکتا ہے۔ اس واقعہ کی تنقیح سے قطع نظر اس امر میں شاید کوئی مضائقہ نہ ہو کہ ایک عورت کی قرآنی بصیرت کسی ایک مسئلہ میں خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ سے زیادہ ہو اس کے لیے امکانِ عقلی تو ہو سکتا ہے۔ لیکن مؤلفِ ممدوح نے جو نکتہ مرتد کے ناقابلِ سزا ہونے کا نکالا ہے وہ ایک خلیفہ کی رائے کے خلاف نہیں بلکہ تمام خلفائے وقت اور ابطالِ ملّت کے خلاف ہے۔ ہمارے نزدیک اس ذہنی بصیرت کے اس اوجِ کمال کی نظیر نہیں مل سکتی۔

اب اگر مسلمانوں میں اتنی ہمت ہے کہ وہ حضرت ممدوح رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کو قرآن کے خلاف ہونے کی بنا پر رد کر دیں تو رد کر دینا ممکن ہوگا لیکن یہ تردید محض حضرت عمرؓ کے قول کی تردید نہ ہوگی بلکہ ملّتِ اسلامیہ کے جس قدر بھی ابطال و اربابِ علم گزرے ہیں، ان سب کے قول کو رد کر دینا پڑے گا۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ کو نہ صرف یہ کہ ملّتِ اسلامیہ نے تسلیم فرمایا ہے بلکہ اسے کتاب اللہ اور ارشادِ رسول اللہ ؐ کے عین مطابق جانا ہے لہٰذا

اس سے انکار ملتِ اسلامیہ سے پھر جانے کے مترادف ہو گا۔

مؤلفِ کتاب نے اس روایت کو قرآن اور سنت کے مطابق بنانے کے لیے یہ تجویز بھی پیش فرمائی ہے کہ یہ تصور کر لیا جائے کہ جتنی بار بھی وہ شخص اسلام سے پھرا اتنی ہی بار وہ دشمنانِ اسلام سے مل گیا ہو گا اس لیے اسے واجب القتل سمجھا جاتا رہا۔

قتلِ مرتد پر حضرت عمرؓ کا افسوس

اس سلسلہ میں مؤلفِ کتاب نے حضرت عمرؓ کے چند مزید واقعات کا ذکر فرمایا ہے، جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ ان واقعات کا اختصار حسبِ ذیل ہے:

۱۔ فتح تستر کے بعد سعدؓ بن وقاص اور ابو موسیٰ اشعریؓ نے ایک قاصد کے ذریعہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کو یہ اطلاع دی کہ انہوں نے ایک عرب کو جو مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو جانے کا مجرم تھا، گرفتار کیا اور اسے قتل کر دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے انہیں لکھا کہ تمہیں چاہیئے تھا کہ اسے ایک کوٹھڑی میں تین دن بند رکھتے اور ہر روز ایک روٹی کا ٹکڑا دیتے، بہت ممکن تھا کہ وہ اس عرصہ میں توبہ کر لیتا۔ پھر انہوں نے جنابِ باریؔ میں معذرت کی، خدایا! (بغیر قید کیے) اس طرح اسے جو قتل کیا گیا وہ میرے حکم سے نہ تھا اور نہ میں اس سے خوش ہوا تاہم اس کی بابت اور کوئی باز پرس ان لوگوں سے نہیں فرمائی جنہوں نے قتل کیا۔

فی الواقع عہدِ خلافتِ عمرؓ میں بھی مرتد کے واجب القتل ہونے کا یہ ایک واضح ثبوت ہے کیونکہ ایک قیدی شخص نہ تو فساد کا موجب ہو سکتا تھا اور نہ وہ محارب تھا اور نہ حضرات سعدؓ بن وقاص اور ابو موسیٰ اشعریؓ احکامِ خدا و رسول سے اس قدر بے خبر تھے کہ ایسے شخص کو جو واجب القتل نہ تھا بے وجہ قتل کر دیتے اور نہ خود حضرت عمرؓ ایسے غیر منصف تھے کہ ناحق قتل پر باز پرس نہ کرتے۔ واضح ہو کہ ان دونوں اصحاب نے اس کے قتل کا سبب مرتد ہونا بتایا ہے اور خود حضرت عمرؓ نے اسے ارتداد کا مجرم قرار دیتے ہوئے یہ چاہتے تھے کہ توبہ کا موقع دیا جاتا باوجود ان واضح قرائن کے جنابِ مؤلف کا فرمانا ہے کہ اسے ارتداد کے جرم میں نہیں بلکہ حربی

ہونے کے جرم میں قتل کیا گیا، عجیب ہے۔

عہدِ عمرؓ کا ایک اور واقعہ

عہدِ خلافتِ عمرؓ کا ایک اور واقعہ بھی درج فرمایا ہے کہ حضرت ابوموسیٰؓ نے حضرت انسؓ کو بمناسبت سفارت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا تو امیرالمومنین نے دریافت فرمایا کہ حاجبہ اور بکر بن وائل اور اس کی جماعت کے لوگ جو مرتد ہو گئے تھے ان کا کیا حشر ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ سب قتل کر دیے گئے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر انہیں زندہ گرفتار کر لیا جاتا تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔ حضرت انسؓ نے کہا، اے امیرالمومنین اگر زندہ گرفتار بھی کر لیے جاتے تو کیا ہوتا۔ پھر بھی انہیں قتل ہی کیا جانا تھا۔ ارشاد ہوا کہ اگر وہ زندہ گرفتار ہو جاتے تو میں ان سے کہتا کہ جس دروازے سے تم باہر آئے ہو وہ اب بھی کھلا ہوا ہے۔ مسلمان ہو جاتے تو بہتر ورنہ میں پھر انہیں قید میں ڈال دیتا تاہم ان کے قتل کو امیرالمومنین نے قتل ناحق قرار نہیں دیا۔

اس واقعہ پر غور کرنے سے نہایت وضاحت کے ساتھ عیاں ہے کہ جرمِ ارتداد کی سزا قتل ہی تھی جو اس وقت سب کو معلوم تھی اور اس پر عملدرآمد تھا اور اسی بنا پر انہیں قتل کر دیا گیا اور خود حضرت عمرؓ نے بھی اس کو درست سمجھا۔

مؤلفِ کتاب کا کہنا یہ ہے کہ ان کو بھی ارتداد کے جرم میں نہیں بلکہ حربی ہونے کے جرم میں قتل کیا گیا۔ ان کے نزدیک حربی واجب القتل ہے حالانکہ شریعتِ اسلامیہ میں حربی واجب القتل نہیں بلکہ واجب القتال ہے۔ اسلام اہلِ حرب کو ہر حال میں واجب القتل قرار نہیں دیتا ان کو قید کیا جا سکتا ہے، غلام بنایا جا سکتا ہے اور جزیہ دینا قبول کر لیں تو بطور رعایا کے رہ سکتے ہیں۔ یہاں پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی غالباً یہی چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ حربیوں کا سا سلوک کیا جاتا نہ کہ مرتدوں کا سا۔

مرتد حربی واجب القتل نہیں ہے

مؤلفِ کتاب نے ہر جگہ یہ موقف اختیار فرمایا

ہے کہ صرف مرتد حربی واجب القتل ہے۔ یہ موقف بجائے خود کمزور ہے حقیقت یہ ہے کہ مرتد حربی ہو جائے تو اس کے لیے قتل کا حکم نہیں ہے بلکہ اس سے قتال کا حکم ہے بدورانِ قتال قتل کیا جائے تو بہتر، زندہ گرفتار ہو جائے تو شاید بعض صورتوں میں دوسرے کفار اصلی کی طرح اس کے ساتھ سلوک کیا جائے۔ اگر جناب مؤلف کے نزدیک ان مرتدین کو بدورانِ حرب ہی قتل کیا گیا ہے۔ تب بھی یہ اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ جرمِ ارتداد مستوجب قتل نہیں ہے۔

عبداللہ بن نواحہ کا واقعہ

عہدِ خلافت عمرؓ کا ایک اور واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ کچھ لوگ مسجد بنی حنیفہ میں مسیلمہ کی نبوت کی تصدیق کر رہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ان سب کو طلب کیا سب نے توبہ و استغفار کا اظہار کیا۔ سب کو چھوڑ دیا گیا صرف ایک شخص عبداللہ بن نواحہ تھا جسے قتل کر دیا گیا۔

مؤلفِ کتاب نے اس کا تو کوئی سبب نہیں بتایا کہ ان امن پسندوں کی آزادیٔ ضمیر پر یہ قدغن کیوں ہوئی کہ انہیں مسیلمہ کی نبوت تسلیم نہ کرنے دی گئی اور ان سے وعدہ لیا گیا کہ آئندہ وہ ایسی حرکت نہ کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ لوگ توبہ نہ کرتے تو ان کو بھی قتل کر دیا جاتا۔ گویا یہ ایک واضح نظیر ہے اس امر کی کہ عہدِ خلافتِ عمرؓ میں جرمِ ارتداد کی سزا قتل ایک عام قانون تھا جس پر عملدرآمد ہوتا تھا۔ رہا عبداللہ بن نواحہ کا واقعہ سو یہ شخص ہے جو مسیلمہ کذاب کا پیرو ہو گیا تھا۔ مسیلمہ نے اس کو حجر بن وثال کے ساتھ خدمتِ نبوی میں بھیجا تھا۔ یہ دونوں یہ دعویٰ لے کر آئے تھے کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ اگر سفیروں کو قتل کرنا جائز ہوتا تو میں تم دونوں کو قتل کر دیتا۔ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جس بنا پر آنحضرتؐ نے اس وقت اس کو قتل نہیں فرمایا تھا۔ اب وہ سبب موجود نہیں اس لیے قتل کر دیا گیا، دوسرا شخص مسلمان ہو گیا تھا اس لیے قتل سے بچ رہا۔

مرتد کی توبہ چنداں قابلِ اعتبار نہیں ہے

مؤلفِ کتاب اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جو مرتد توبہ کر لے وہ لازمی طور پر مستوجب سزا

نہیں رہتا۔ حقیقت یہ ہے کہ توبہ کرنے کے باوجود بھی اگر قتل کر دیا جائے تو قاتل قابل مؤاخذہ نہیں ہے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ آیا استتابہ (توبہ کی ترغیب) ضروری ہے یا نہیں یہ فیصلہ حاکم وقت کا کام ہے کہ توبہ قبول کرے یا نہ کرے۔ اگر وہ شریعت کے اس مسئلہ کو پیش نظر رکھتے تو انہیں عبداللہ بن نواحہ کے قتل پر تعجب نہ ہوتا۔ بہر حال اس تمام واقعہ سے نہایت وضاحت کے ساتھ یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں مرتد واجب القتل ہے۔

کاش کہ فاضل مؤلف تمام ذخیرۂ اسلامیات سے کوئی ایک نظیر بھی ایسی پیش فرماتے کہ کوئی شخص مرتد ہوا ہو اور اسے قتل نہ کیا گیا ہو۔ اس کے برعکس ایسی بے شمار نظائر ہیں کہ اہل حرب کو معاف کر دیا گیا اور بعض کو حالت کفر میں بھی ایک امن پسند شہری کی طرح اسلامی حکومت کے زیر تحفظ رہنے کی اجازت دی گئی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اس نظریہ کو باطل کرتی ہے کہ ہر حربی مستوجب قتل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس ہر مرتد مستوجب قتل ہے خواہ وہ حربی ہو یا نہ ہو۔ حرب سے ہاتھ اٹھا لینے کے بعد کافر واجب قتل نہیں رہتا خواہ وہ کافر ہی رہے لیکن مرتد حرب سے دست بردار ہونے کے بعد بھی مستوجب قتل ہی رہتا ہے تاآنکہ ارتداد سے توبہ نہ کرے۔

ہر حربی واجب القتل نہیں ہے

یاد رہے کہ کوئی حربی جب گرفتار ہو کر آئے تو وہ بہر حال واجب القتل نہیں ہوتا تاآنکہ وہ مرتد نہ ہو جس کے معنے یہ ہیں کہ حربی ہونا مستوجب قتل نہیں ہے بلکہ مرتد ہونا موجب قتل ہے جناب مؤلف نے اپنی تمام کتاب میں اس صحیح نظریہ کے برعکس یہ تاثر دینے کی کوشش فرمائی ہے کہ مرتد کو قتل نہیں کیا جا سکتا تاوقتیکہ وہ مرتکب حرب نہ ہو۔ یہ بالکل الٹی بات ہے۔

مرتدہ لونڈی کو قتل نہیں کیا گیا

اس سلسلہ میں جناب مؤلف نے دو اور واقعات کا سہارا لیا ہے، ایک یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک لونڈی ام ولد کو جس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ قتل کا حکم

نہیں دیا بلکہ اسے ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کر دینے کا حکم دیا جو عیسائی نہ ہو۔ اس باب میں بالوضاحت بتایا گیا ہے کہ فی الجملہ مرتد عورت کو قتل کرنے کا حکم نہیں ہے تاہم اس حکم سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ارتداد ایک جرم مستوجب تعزیر ہے گو تعزیر کی نوعیت مردوں اور عورتوں کے لیے مختلف ہے۔ تعجب ہے کہ اس واقعہ کو اس امر کے ثبوت میں کس طرح پیش کر دیا گیا کہ اسلام میں مرتد کی کوئی سزا ہی مقرر نہیں ہے۔

عہدِ عمرؓ کا دوسرا واقعہ

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ خود عہد نبوی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نجران کے عیسائیوں کو ان کی جلاوطنی کے احکام صادر ہونے سے پہلے لکھا تھا کہ ان میں سے جو شخص اسلام کی بجائے عیسائیت اختیار کرے گا اس کی جان کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسے زندہ رہنے نہ دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ تحریر فرمایا ہے کہ اس کے بعد جو لوگ اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گئے یا ہونا چاہتے تھے ان کو کوئی دھمکی نہیں دی گئی گویا پہلے جو کہا گیا تھا کہ ان کے تحفظ کی ذمہ داری نہ رہے گی۔ یہ کوئی دھمکی نہ تھی بلکہ شاید مذاق تھا جس پر عمل نہیں کیا گیا۔

فاضل مؤلف کتاب نے حضرت عثمان کا یہ واقعہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب "سیاسی وثیقہ جات" کے اردو ترجمہ (ابو یحییٰ امام خان نوشہروی) کے صفحات ۱۱۵-۱۱۶ سے نقل فرمایا ہے اب ذرا اس کتاب کی اصل عبارت ملاحظہ فرمائیے:۔

"..... بعد ازیں یہ کہ تم نے اپنے مسلمان ہونے کا اعتراف کیا اور اس کے بعد مرتد ہو گئے۔ اب بھی تم میں سے جو شخص توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لے اس کے ارتداد پر مؤاخذہ نہ ہوگا۔ ہم اس کے ساتھ بہتر سلوک کریں گے تم گزشتہ اعمالت یاد کرلو اور خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو، تم میں سے جو شخص مسلمان ہو جائے اس کے لیے سلامتی کی خوشخبری ہے اور جو شخص اسلام کی بجائے نصرانیت قبول کر کے

اس پر اکتفا کرے تو ہمیں اس کی امان سے کوئی سروکار نہیں "

حضرت عمرؓ کے اس صاف اور صریح حکم کو جس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کوئی عیسائی مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو جائے تو اس کی امان سے حکومتِ اسلامیہ کو کوئی سروکار نہیں وہ بہر حال قتل کیا جائے گا۔ مقامِ افسوس ہے کہ جناب مؤلف جیسی ذمہ دار شخصیت نے اس بے رحمی سے خلیفۂ وقت کے ارشادات کو غلط پیرایہ میں پیش فرما کر ظلم کیا ہے۔

قتلِ مرتد کے بارے میں حضرت عثمانؓ کا حکم

جنابِ مؤلف نے اس کے بعد عہدِ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایسے واقعات کا ذکر فرمایا ہے جن سے قتلِ مرتد کا ثبوت ملتا ہے لیکن ان کے نزدیک وہ بھی قابلِ تعبیر ہے مثلاً حضرتِ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ واضح ارشاد ہے کہ جو شخص بھی ایمان لانے کے بعد اس سے پھر جائے اسے قتل کر دیا جائے (ص۹۱) مؤلف ممدوح فرماتے ہیں کہ اس حکم میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ کن حالات میں وہ شخص واجب القتل ہے۔ یعنی حکم میں یہ وضاحت جو کی گئی ہے کہ جو شخص ایمان لانے کے بعد اس سے پھر جائے وہ واجب القتل ہے۔ یہ وضاحت اس وقت تسلیم نہ کی جائے گی جب تک کہ یہ بھی نہ کہا جائے کہ مرتد ہو کر جنگ کرے تب قتل کیا جائے۔ پھر ارشاد ہے کہ اس کے لیے قرآن وسنت کے کسی فیصلہ کا حوالہ بھی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خلیفۂ سوئم کا یہ حکم بظاہر کتاب وسنت سے بے نیاز کر دیا گیا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ اگر اس حکم کو محاربِ مرتد کے لیے مخصوص کر دیا جائے، تو بلا شبہ یہ قرآن اور سنت کے مطابق ہو جائے گا۔ اب یہ کس طرح سمجھایا جائے کہ خلیفہ ممدوحؓ نے تو یہ حکم اپنی دانست میں قرآن وسنت کے مطابق ہی دیا تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ یہ حکم اس قرآن وسنت کے مطابق نہ ہو جو مؤلف کتاب کے پیشِ نظر ہے۔

سلمان بن محبے مرتد کا واقعہ

دوسرا واقعہ یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک مرتد سلمان ابن محبے سے تین بار اپنے ارادہ سے باز آ جانے کے لیے کہا اس نے نہ مانا اور آخر اسے قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس کی بابت بھی ارشاد ہے کہ جن حالات میں حکم دیا گیا تھا تاریکی میں ہیں حالاں کہ حالات کی وضاحت اس سے زیادہ ممکن ہی نہ تھی۔ لہذا ہر شخص یہی تصور کریگا کہ مزور وہ شخص باغی ہوگا لیکن ایک شخص بھی ایسا تصور نہ کر سکا۔ مقام غور ہے کہ مؤلف کتاب نے کیسے کیسے توہمات کی بنا پر توضیحات خلفائے راشدین کو نظر انداز فرما دیا ہے۔

عہد عثمان کی ایک مرتد جماعت

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے جناب عثمانؓ کی خدمت میں لکھا کہ عراق میں ایک جماعت مرتد ہو گئی ہے ان کی بابت کیا حکم ہے؟ خلیفۂ ممدوح نے لکھا کہ انہیں اسلام پیش کیا جائے۔ اگر وہ مان جائیں تو انہیں چھوڑ دیا جائے، اگر انکار کریں تو انہیں قتل کر دیا جائے۔ مؤلف محقق نے فرمایا ہے کہ اخبار زمیندار نے اس روایت میں قتلوا کی بجائے قاتلوا لکھا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ ان کے ساتھ مقاتلہ کیا جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی آمادۂ جنگ تھے لہذا قتل کا حکم دیا گیا۔ لیکن یہ نہیں فرمایا کہ آخر حضرت ابن مسعودؓ اپنے خط میں یہ لکھنا کیوں بھول گئے کہ یہ جماعت مرتدین آمادۂ حرب ہے اور زمیندار کے نامہ نگار کو یہ الہام کس طرح ہوا کہ قتلوا کی بجائے قاتلوا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قاتلوا کے اصل معنی یہ ہیں کہ ان سے جنگ کرو۔ یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ فریق ثانی آمادۂ جنگ ہو، تب ہی لڑو بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ جماعت مستوجب قتل ہے۔ اگر لڑے تو لڑ کر بھی قتل کر سکتے ہو یعنی اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

ان صریح احکامات کی موجودگی میں کوئی شخص بھی یہ کیونکر تصور کر سکتا ہے کہ خلفائے راشدین نے مرتد کو مستوجب قتل نہیں سمجھا بلکہ صرف محاربین کو مستوجب قتل قرار دیا ہے۔

عہدِ خلافتِ علیؓ کے واقعات

اس کے بعد عہدِ خلافتِ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واقعات کا ذکر ہے صٰ۹۵ اور سب سے پہلے خارجیوں کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جنگ کا ذکر ہے اور بتایا ہے کہ ان کا خیال یہ تھا کہ جو لوگ ان کے ہم عقیدہ نہیں ہیں ان کو قتل کر دیا جائے چنانچہ انہوں نے بعض مسلمانوں کو قتل بھی کیا۔ اس لیے ان سے جنگ ہوئی اور قتل کیے گئے ورنہ فی الواقع وہ لوگ مسلمان تھے اور خود حضرت علیؓ بھی انہیں مسلمان ہی تصور کرتے تھے۔ قطع نظر اس کے کہ کہاں تک مؤلفِ کتاب کی تحقیق درست ہے۔ اگر فی الواقع وہ مرتد نہ تھے اور مسلمان تھے اور پھر بھی قتل کر دیے گئے تو بلا شبہ یہ قتلِ مرتد کا واقعہ نہیں ہے بلکہ قتلِ ناحق کی نظیر ہے جس میں حضرت علیؓ کو ملوث قرار دیا گیا ہے نعوذ باللہ۔ اس واقعہ کو خارج از بحث ہی مان لیجیے۔

اس کے بعد دوسرا واقعہ ہے جس میں بعض زندیقوں کو حضرت علیؓ نے زندہ جلانے کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے یہ سنا تو فرمایا کہ:

"اگر میں ہوتا تو ان کو نہ جلاتا کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو منع فرمایا ہے بلکہ ان کو قتل کر ڈالتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی حکم ہے کہ دین سے جو لوگ پھر جائیں انہیں قتل کر دیا جائے۔"

یہ عبارت میں نے ترجمہ بخاری ج ۲ کے صفحہ ۵۹۶ سے بلفظہٖ نقل کی ہے جس کا حوالہ مؤلفِ کتاب نے دیا ہے لیکن اس کا جو ترجمہ انگریزی میں انہوں نے کیا ہے (صنٰا) وہ اس سے بہت مختلف ہے تاہم مفہوم تقریباً یکساں ہے اور اس سے صاف عیاں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی حضرت علیؓ ہی کی طرح مرتد کو مستوجب سزائے موت سمجھتے تھے اختلاف صرف قتل کے طریقہ کا تھا۔ جناب مؤلف نے اس حدیث پر بھی جرح فرمائی ہے کہ اول تو یہ حدیث ہی قابلِ اعتبار نہیں دوسرے اگر صحیح بھی ہو تو یہ لوگ ابن صبا کے پیرو تھے اور ابن صبا کو آنحضرت نے مدائن کی طرف جلا وطن کرا دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ

یہ تمام صباٸی معاشرتی نظم کو درہم برہم کرنے والے تھے اس لیے ان کو قتل کیا گیا نہ کہ محض مرتد ہونے کی وجہ سے۔ مؤلفِ ممدوح کے اس ارشاد میں کہاں تک زور ہے۔ وہ تو قارئین خود اندازہ لگائیں گے لیکن اتنا ضرور معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک معاشرتی نظام میں خلل اندازی تو بلاشبہ مستوجبِ قتل ہے لیکن کسی مسلمان کا اسلام سے پھر جانا کوئی جرم نہیں ہے اور غالباً اس سے کسی معاشرتی نظام میں خلل بھی نہیں پڑتا۔ مزید برآں ان کے خیال میں بخاری کی یہ حدیث قابلِ انکار ہے لیکن انہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے معاشرتی نظام کو درہم برہم کیا تھا گو اس کا کوئی ثبوت نہیں بتایا پھر یہ بھی نہیں بتایا کہ آخر ابن صبا کی طرح اسے جلا وطن کرنے پر کیوں اکتفا نہ فرمایا گیا اور اس بری طرح سے حضرت علی نے کیوں مروا دیا۔

قبیلہ بنی نجیہ کے مرتدین کا واقعہ

عہد خلافت حضرت علی کا ایک اور واقعہ درج فرمایا ہے کہ حضرتِ ممدوح نے قبیلہ بنی نجیہ کے خلاف ایک مہم بھیجی تھی وہ لوگ تین جماعتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ مسلمان ہو گیا۔ دوسرا بدستور عیساٸی رہا۔ ان سے کوئی بازپرس نہ ہوئی۔ تیسرا گروہ مسلمان ہو کر مرتد ہو گیا تھا انہیں پھر مسلمان ہونے کے لیے کہا گیا۔ انہوں نے انکار کیا تو ان کو قتل کر دیا گیا۔ اور ان کے خاندان والے غلام بنا لیے گئے۔ گویا مہم پورے قبیلہ کے خلاف تھی۔ مسلمانوں کو تو درگزر کیا ہی گیا عیساٸیوں کو بھی کچھ نہ کہا گیا جو مرتد تھے ان سب کو قتل کر دیا گیا۔ یعنی محض ارتداد جرم مستوجب قتل تھا۔ یا یوں سمجھیے کہ ارتداد اور بغاوت دونوں نتیجۃً ایک ہیں۔

مؤلفِ کتاب کا ارشاد ہے کہ اس واقعہ سے ان لوگوں کے عندیہ کو کوئی تقویت نہیں پہنچتی کہ ارتداد جرم ہے محض ایک معصیت اکرد خطا ہے۔ لیکن اس واقعہ سے اس خیال کو کیسے تقویت پہنچتی ہے کہ ارتداد نہ جرم ہے، نہ ارقابلِ تعزیر ہے۔

ابن قبیصہ مرتد کا واقعہ

حضرت علی کے عہد کا ایک اور دلچسپ واقعہ ابن قبیصہ کا ہے کہ وہ مسلمان ہوا۔ پھر

ترکِ اسلام کر کے عیسائی ہو گیا۔ اسے حضرت علیؓ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے حضرت ممدوحؓ کے کان میں کوئی بات کہی۔ اس کے بعد اسے قتل کر دیا گیا (یعنی اس کا اسلام لانا ثابت نہیں بلکہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ اس نے حضرتؓ کے کان میں پھر اپنے ترکِ اسلام کا اعتراف ہی کیا ہو) لیکن مؤلف نے اس واقعہ سے بھی یہی نتیجہ نکالا ہے کہ ضرور وہ محارب تھا۔ گویا ان کو یہ یقین ہے کہ حضرت علیؓ کے کان میں رازدارانہ طور پر اس نے اپنے محارب ہونے کا اعلان کیا جس پر قتل کر دیا گیا۔ اس کے برعکس قیاس یہ کہتا ہے کہ ان سے اپنی جان بچانے کے لیے امن پسندی کا وعدہ کیا ہوگا تاہم حضرت علیؓ نے قتل کا حکم دیا۔ غرض ان تمام احادیث سے اس کے سوا اور کچھ نہیں ثابت ہوتا کہ بجز جرمِ ارتداد اور کوئی جرم نہ تھا جو بحیثیت مجرم خلیفہ وقت کے سامنے پیش کیے جانے کا موجب ہوا اور اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مرتد واجب التعزیر نہیں ہے مؤلف کتاب نے ان روایات کو بھی محلِ نظر بتایا ہے۔ کاش! وہ کوئی ایسی ہی روایت اس امر کے ثبوت میں پیش فرماتے کہ کوئی مرتد امن پسند رہا ہو اور اسے باوجود مرتد ہونے کے قتل نہ کیا گیا ہو۔

قتلِ مرتد کا ایک تاریخی واقعہ

پھر ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۴ء کی اشاعت اخبار زمیندار کے حوالے سے بتایا ہے کہ کسی گمنام شخص نے سنن نسائی وغیرہ کی روایت سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت علی نے حرورہ والوں کے خلاف حضرت ابن عباس کی سرکردگی میں مہاجرین و انصار کی ایک جماعت کو بھیجا کہ انہیں اسلام کی دعوت دے چنانچہ ان میں سے دو ہزار تو مسلمان ہو گئے باقیوں کو قتل کر دیا گیا۔ مؤلف ممدوح فرماتے ہیں اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ محض مرتد ہونے کی وجہ سے انسے کو مستوجب سزا قرار دیا گیا کیونکہ انہوں نے بھی غداری کی ہوگی جب ہی قتل کیے گئے۔ غرض مؤلف کے نزدیک اتنے مستوجب قتل مرتدین میں سے کوئی فرد ایسا نہ تھا جو ارتداد کے باعث مستوجب سزا قرار دیا گیا ہو اور آخر میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جن مرتدوں کو روایات میں

قتل کی سزا دی گئی ہے وہ روایتیں یا تو غلط ہیں اور یا وہ لوگ سنت سے منحرف ہوں گے اس لیے قتل کیے گئے لہٰذا اس سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ مرتد واجب القتل ہے۔ اس کے برعکس بیشتر حالات میں یہی قیاس کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے ایک اچھے شہری ہونے کی حدود سے تجاوز کیا یا مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جس کے باعث ان کو سب سے بڑی سزائے موت کا مستوجب قرار دیا گیا ورنہ محض ارتداد کوئی جرم نہ تھا۔ ہم یہاں پر یہی سوال جناب مؤلف سے کرتے ہیں کہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے شہری ہونے کی حدود سے تجاوز کرنے یا مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کو نقصان پہنچانے کی پاداش میں قتل کا حکم دیا ہے؟ یا کوئی ایک نظیر بھی ان کے ذہن میں ایسی ہے کہ کوئی ایسا مرتد خلفائے راشدین میں سے کسی کے سامنے پیش کیا گیا ہو جسے مستوجب سزائے موت نہ قرار دیا گیا ہو یا پھر ان کا مطلب شاید یہ ہو کہ کوئی مرتد ایسا تھا ہی نہیں جس نے ایک اچھے شہری ہونے کی حدود سے تجاوز نہ کیا ہو یا مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کی ہو۔

(۴)

فقہاء کے فیصلوں پر تبصرہ

مؤلف کتاب نے جس طرح احادیث کے مطالب اور خلفائے راشدین کے تعامل سے یہ نتیجہ اخذ فرمایا ہے کہ ارتداد جرم مستوجب قتل نہیں ہے تا آنکہ وہ حربی نہ ہو جائے اسی طرح محض اپنی ذہانت کے بل بوتے پر فقہاء کے فیصلوں سے بھی یہی نتیجہ اخذ فرمانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں مرتد مستوجب سزائے "قتل نہیں ہے"۔ انہوں نے اپنی کتاب کے عنوان "ارتداد اور فقہاء" کے تحت ۲۷ صفحے میں فقہاء کے طرز استدلال اور اجتہاد کے بارے میں خامیوں کا ذکر فرمایا ہے لیکن ائمہ فقہا بلکہ علمائے امت میں سے کسی ایک فرد کا ایسا قول یا فتوے نقل نہیں فرمایا جس میں مرتد کو قتل کا مستوجب قرار دیا گیا ہو۔ اس کے

برعکس ان کو اعتراف ہے کہ تمام فقہاء نے بالاتفاق ارتداد کی سزا قتل قرار دی ہے اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ:۔ ص۱۲۲

"رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفاء راشدین کے زمانے میں جن مرتدین کو قتل کیا گیا ان میں بیشتر وہ تھے جنہوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی۔ چنانچہ ان ایام میں یہی خیال کیا جاتا تھا کہ جو شخص اسلام سے پھر گیا وہ دشمنانِ اسلام کے ساتھ مل گیا اور تاریخ بھی اس کی تصدیق کرتی ہے جس کی وجہ سے قدمائے فقہاء کی تحریروں میں ان مرتدوں کے درمیان جنہوں نے محض مذہب تبدیل کیا اور وہ مرتدین جو ملت کے دشمن بھی ہو گئے امتیاز نہیں کیا گیا اور ایک عرصہ کے بعد ہی ایک قانون بنا لیا گیا کہ جو مرتد توبہ نہ کرے تو اسے واجب القتل قرار دیا جائے" (خواہ وہ کیسا ہی ہو)

فاضل مؤلف نے فقہا کے دینی استنباط میں سزائے قتل جیسے اہم مسئلہ پر فقہاء کی جس سہل انگاری اور غفلت کی نشان دہی فرمائی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید عہدِ نبوت و خلافتِ راشدہ میں کوئی ایک مرتد بھی ایسا سامنے نہیں آیا جو حربی نہ ہوا ہو یا جس نے مرتد ہونے کے بعد حکومت سے بغاوت نہ کی ہو حالانکہ عبارتِ بالا میں بتایا گیا ہے کہ بیشتر مرتدین ایسے تھے جو اسلامی حکومت سے باغی ہو گئے تھے یعنی کچھ ایسے بھی تھے جو پُرامن تھے لیکن ایسے پُرامن مرتدوں میں سے حضور کو یا حضور کے خلفائے راشدین میں سے کسی کو سابقہ نہیں پڑا ورنہ وہ اسے معاف کر دیتے۔ اور پھر شاید امتِ مرحومہ کا کوئی ایک عالمِ دین بھی ایسا نہ تھا کہ ایسی غلطی سے بچ جاتا۔ بصورتِ موجودہ تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ تمام فقہاء اس امر پر متفق ہیں کہ مرتد اگر توبہ نہ کرے تو واجب القتل ہے کیونکہ مؤلفِ محقق ایک فقیہ کا قول بھی اس کے خلاف نہ پیش کر سکے اور نہ ایسے ایک مرتد کی نشاندہی فرما سکے جس کو بغیر توبہ کیے بری کر دیا ہو تو اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ خود ہی غلطی پر ہیں

اور ذخیرۂ احادیث و آثارِ صحابہ کا دراصل وہی مدعا ہو جو فقہائے امت نے سمجھا۔ یہاں پر یہ اعادہ کرنا ضروری ہے کہ جن مرتدین کے قتل کا حکم ہوا ان میں سے کوئی بھی حربی نہ تھا اور نہ حکومت کا باغی تھا۔ اگر کوئی ایسا تھا تو اسے قتل کا حکم نہیں بلکہ اس سے مقاتلہ یا قتال کا حکم دیا جاتا جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں اور قتال کا حکم قتل کے حکم سے بالکل مختلف ہے جن سے قتال کا حکم ہے انہیں بلاشبہ معاف کیا جا سکتا ہے ان کا قتل لازمی نہیں ہے بشرطیکہ حرب سے باز رہیں لیکن جنہیں قتل کا حکم ہے انہیں معاف نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ کتنے ہی پُرامن ہوں اور بغاوت سے باز رہیں۔

فقہاء کی متفقہ رائے

فقہاء کے باب میں مؤلفِ کتاب نے یہ تسلیم فرمایا ہے کہ سب نے مرتد کو واجب القتل قرار دیا ہے۔ البتہ اس باب میں اختلاف ہے کہ قتل سے پہلے ان کو توبہ و بازگشت کا موقع دینا چاہیئے یا نہیں اور آیا مرتدہ عورت بھی مردوں کی طرح مستوجبِ قتل ہے یا نہیں؟[۴]

مؤلف کا یہ نظریہ کہ اس اختلاف کی بنا پر سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ فقہاء کے نزدیک ارتداد کوئی جرم ہے یا نہیں ہے۔ نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے اس اختلاف کی بنا پر یہ سوال تو اٹھایا جا سکتا ہے کہ آیا مرتد کو ہر حال میں توبہ کا موقع دینا چاہیئے یا نہ دینا چاہیئے۔ یہ سوال تو پیدا ہی نہیں ہوتا کہ آیا ارتداد جرم ہے یا نہیں ہے؟ حیران ہوں کہ مؤلف نے اس اختلاف کی بنا پر کس طرح فقہاء کے خیال کی معقولیت کو محل نظر قرار دیا ہے ص۱۰۳

فقہاء کا اختلاف

یہ صورتِ حال اور بھی حیرت انگیز ہو جاتی ہے جب مؤلف موصوف کی وسیع النظری کو دیکھا جائے کہ انہوں نے اس بارے میں جن اختلافات کا ذکر کیا ہے ان سب سے یہ امر یقینی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ فقہاء میں سے کسی کو مرتد کے واجب القتل ہونے میں اختلاف نہیں ہے چنانچہ انہوں نے الدمشقی کے حوالے سے بتایا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ

فرماتے ہیں کہ استتابہ یعنی توبہ کی فہمائش ضروری نہیں ہے ہاں اگر مرتد خود درخواست کرے کہ اسے اپنے خیال پر نظرثانی کا موقع دیا جائے تو تین دن تک اسے مہلت دی جاسکتی ہے۔ اگر توبہ نہ کرے تو اس کے بعد اسے قتل کر دیا جائے۔ امام مالکؒ کہتے ہیں کہ یہ ضروری ہے کہ اسے توبہ کرنے کو کہا جائے اور ان کے نزدیک بھی اس کے لیے تین دن کی مہلت ہوسکتی ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے ارشادات سے دونوں مندرجہ بالا خیالات کی تائید ہوتی ہے۔ مقام غور ہے کہ خیالات کی اس یک رنگی کو مؤلف نے مختلف فقہاء کے خیالات میں ایسا تضاد قرار دیا ہے جس سے ان کے نزدیک مرتد کا مستوجب سزا ہونا مشتبہ ہو جائے۔ پھر حضرت حسن بصریؒ کا ارشاد منقول ہے کہ استتابہ کی ضرورت نہیں، مرتد کو فوراً قتل کر دینا چاہیئے۔ حضرت عطاءؒ کہتے ہیں کہ جو شخص پیدائشی مسلمان ہو اور مرتد ہو جائے تو اسے فوراً قتل کر دیا جائے لیکن جو شخص بعد میں مسلمان ہوا اور مرتد ہو گیا تو اس کے لیے استتابہ ضروری ہے۔ اس خیال کی بابت مؤلف کتاب کا ارشاد ہے کہ اس امتیاز میں کوئی معقولیت نہیں ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ اور ابراہیم النخعیؒ کے بارہ میں بحوالہ کتاب المغنی ص۱۲۰ بتایا گیا ہے کہ اس صورت حال کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ مرتد کو کبھی قتل نہیں کیا جاسکتا لیکن وہاں یہ تفصیل سرے سے موجود ہی نہیں ہے لہذا یہ غلط بیانی ہے جس سے کوئی دعوے ثابت نہیں ہو سکتا۔

قتل مرتد کے بارے میں امامیہ کا نظریہ

امامیہ میں سے الطوسی کا خیال یہ ہے کہ مرتد سے صرف دو بار توبہ کے لیے کہا جائے۔ نہ مانے تو قتل کر دیا جائے۔ انہوں نے تین دن کی قید نہیں لگائی۔ طوسی نے ہی حضرت علیؓ کا یہ واقعہ درج فرمایا ہے کہ ایک مسلمان جو عیسائی ہو گیا تھا اس سے آپ نے دو بار مسلمان ہونے کی درخواست کی اس نے انکار کیا تو قتل کر دیا گیا۔

مرتد کے لیے مہلت توبہ ضروری نہیں ہے

مندرجہ بالا واقعہ سے طوسی نے یہ معنی لیے ہیں کہ مرتد کو توبہ کی مہلت دینا ضروری نہیں

طوسی نے ایک دوسرا واقعہ یہ بتایا ہے کہ حضرت علیؓ نے استتابہ کے لیے تین دن کی مہلت رکھی ہے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ امام ابن تیمیہؒ بھی یہ ضروری خیال نہیں فرماتے کہ قتل کرنے سے پہلے لازمی طور پر توبہ کے لیے کہا جائے۔ تاہم انہوں نے فرمایا ہے کہ اگر وہ از خود توبہ کرے تو سزائے موت سے بری کیا جا سکتا ہے۔ علامہ سرخسی نے تین دن تک کی مہلت کو بیع میں اصولِ خیار کے مماثل قرار دیا ہے یعنی جس طرح خریدار کو تین دن تک واپسی مال کا اختیار ہوتا ہے اسی طرح مرتد کو بھی تین دن تک اپنے عقیدہ سے پھر جانے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ مؤلفِ کتاب کو سرخسی کی اس تمثیل پر اعتراض ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ خیار کا تعلق معاملات سے ہے اور ارتداد کا تعلق ضمیر سے۔ اس لیے خیار کو توبہ کی میعاد سے مماثل قرار نہیں دیا جا سکتا[۴۱]۔ حالانکہ علامہ سرخسی کا مقصد دونوں میں محض مہلت کی یکسانیت بتانا مقصود تھا۔ مسئلہ کی بنا قرار دینا نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ اس پر کیوں اعتراض کیا گیا۔ جہاں تک کہ علامہ سرخسی کی اپنی رائے کا تعلق ہے خود مؤلف کتاب نے بتایا ہے کہ وہ حضرت عمرؓ کے عمل کی بنیاد پر تین دن کی مہلت پر عمل کرنے کے قائل ہیں۔ پھر بحوالہ السرائی بتایا گیا ہے کہ حضرت علیؓ نے کبھی تین دن کی کبھی ایک دن کی اور ایک بار ایک ماہ کی مہلت منظور فرمائی۔ مؤلفِ کتاب نے ان تمام ائمہ فقہاء و تعاملِ صحابہ کے مقابلہ میں السرائی کے اس خیال کا ذکر فرمایا ہے کہ مرتد کو کتنی مہلت دی جائے اس کا اختیار حکومت یا اقتدار اسلامی کو ہے لیکن اس کی تائید میں انہوں نے ائمہ فقہاء و خلفائے راشدین میں سے کسی کا عمل یا قول پیش نہیں فرمایا۔

پھر السرائی کا قول بحوالہ السیوطی درج فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مرتدین کی توبہ کو قبول فرمایا[۴۲] اس سلسلہ میں مولفِ کتاب نے بعض مرتدوں، منافقوں اور اللہ تعالیٰ کے باب میں شانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں گستاخی کرنے والوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے بعض مرتدوں کی توبہ حضور نے قبول فرمائی اور بعض منافقوں کو نظر انداز فرمایا اور مؤلفِ کتاب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مرتدین اس دنیا میں کسی سزا کے مستوجب نہیں ہیں۔

لیکن یہ نہیں بتایا کہ ان تمام واقعات سے آخر یہ نتیجہ کہاں سے نکلتا ہے کہ کسی مرتد کو جس نے توبہ نہ کی ہو سزائے موت سے بری کر دیا گیا۔ اس کے بعد تحریر امام شافعی، امام محمد حنفی ابوالقیم ظاہری وغیرہ کے باب میں درج ہے کہ تین مرتبہ پھر سے دین اسلام تبدیل کرنے والے کی توبہ مانی جائے گی چوتھی بار اسے قتل کر دیا جائے گا۔ امام حنبل کہتے ہیں کہ اگر کوئی دوسری بار پھر مرتد ہو جاتا ہے تو اسے کوئی موقع نہ ملنا چاہیئے اور اس کا ثبوت انہوں نے قرآن حکیم کی آیت سے دیا ہے۔

اس کے بعد مؤلف کتاب نے ایسے حوالہ جات احادیث و ائمہ فقہاء کے دیے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ توبہ کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا ہوا ہے۔ وہ موت سے پہلے کسی وقت بھی توبہ کر سکتا ہے اور پھر ارشاد ہے کہ الثوری اور النخعی کا یہ خیال درست ہے کہ توبہ کا موقع تا مینِ حیات باقی رہتا ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے۔

اس خیال کے ثبوت میں یہ حدیث بھی پیش فرمائی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص توبہ کرے آفتاب کے مغرب سے نکلنے سے پہلے (یعنی قیامت سے پہلے) اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ گویا الثوری اور النخعی کا یہ خیال ہے کہ کسی مرتد کو تا مینِ حیات توبہ کی مہلت دی جانی چاہیئے اور اسے قتل کی سزا نہیں دی جائے گی باوجود اس کے خود مؤلفِ کتاب نے بتایا ہے کہ یہ حضرات زیادہ سے زیادہ تین دن کی مہلت دیتے ہیں اور اس کے بعد قتل کا فتویٰ دیتے ہیں۔ یعنی وہ اس حدیث کے خلاف کرنے پر تلے ہوئے ہیں

یہ عاجز یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ فاضل مؤلف جو فراست کے ایک تسلیم شدہ مجسمہ ہیں، اس سے یہ نتیجہ کس طرح اخذ فرما سکتے ہیں کہ کسی شخص سے کسی جرم کی باز پرس تا قیامت نہیں کی جا سکتی۔ کیا احمق سے احمق شخص بھی یہ تصور کر سکتا ہے کہ جھوٹ، فریب، قتل کے علاوہ کفر، دشنام طرازی، خدا و رسول کی شان میں گستاخی، اسلام کے خلاف زہر افشانی اور دیا اسلام سے پھر جانے کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء یہ ہے کہ اسے تا مینِ حیات توبہ

کرنے کا موقع دیا جائے اور اس سے کچھ باز پرس نہ ہوگی۔ بلاشبہ ہر خطا یہاں تک کہ شرک و کفر سے بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے لیکن حدیث کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ایک جرم کرنے کے بعد سزا کا مستوجب نہیں رہتا۔ کیا کوئی دلیل اس امر کی ہے کہ مرتد کی سزائے قتل تو موقوف رکھی جائے اور قتل کرنے والے کو تاحینِ حیات توبہ کی مہلت نہ دی جائے حدیث کا منشا صرف یہ ہے کہ کیفرِ کردار کو پہنچنے سے پہلے اگر کوئی شخص توبہ کرے تو اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور وہ عذابِ آخرت سے بچ سکتا ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اپنے جرم کی سزا سے بھی بچ جائے گا۔ مؤلف موصوف شاید اس امر سے واقف نہیں ہیں کہ بعض جرائم کی سزا بجائے خود ایک توبہ ہے جو اللہ قبول فرماتا ہے اور عذابِ آخرت سے بچا لیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مرتد نے بھی اگر توبہ کر لی ہو اور حاکمِ وقت کو اس کی توبہ کا علم نہ ہوا اور وہ ارتداد کے جرم میں قتل کر دیا جائے تو اللہ کے نزدیک اس کی توبہ قبول ہوگی اور وہ بخش دیا جائے گا۔ غرض تا قیامت توبہ قبول ہونے کے ہرگز یہ معنے نہیں ہیں کہ کسی مجرم کو توبہ کے انتظار میں تاحینِ حیات سزا نہ دی جائے۔ مجھے اس کتاب میں سب سے زیادہ حیرت ان دلائل پر ہوتی ہے جو اس قدر کمزور ہیں بے تعلق ہیں کہ کوئی دانشمند اسے ایک لمحہ کے لیے بھی قبول نہیں کر سکتا۔ اس مقام پر سوال کیا جا سکتا ہے کہ آیا ان کے نزدیک کوئی جرم ایسا نہیں ہے جسے توبہ کے انتظار میں تاحینِ حیات ناقابلِ سزا قرار دیا جائے۔ اگر ایسے جرائم ہیں تو آخر اس حدیث سے ان کی استثنا کہاں سے ہوتی ہے۔

آگے چل کر مؤلف کتاب فرماتے ہیں کہ مرتدین کے لیے مہلت کی میعاد کے بارے میں سب کا اتفاق ثابت نہیں ہے اور اسی طرح فقہا بھی ایک مقررہ میعادِ مہلت پر متفق نہیں ہیں انہوں نے صرف اپنے اجتہاد سے کام لیا ہے۔ پھر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان کا یہ اجتہاد خلافِ قرآن و حدیث ہے۔ اس لیے ناقابلِ تسلیم ہے۔ حالانکہ ہر ایک نے قرآن و حدیث سے اپنے خیال کی تائید میں آیات و احادیث پیش کی ہیں گویا مؤلف کتاب کا

دعوے یہ ہے کہ ان سب نے قرآن و حدیث کا مطلب غلط سمجھا اور انہیں نظر انداز کر دیا۔ صحیح مطلب صرف وہ ہے جو انہوں نے اخذ فرمایا اور وہ مطلب یہ ہے کہ قرآن اور حدیث میں کہیں بھی مرتد کو مستوجب قتل نہیں قرار دیا گیا۔ مستوجب قتل صرف وہ ہے جو محارب ہو۔ مؤلفِ کتاب کے اس مؤقف کا تسلیم کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا یہ تسلیم کرنا کہ صرف انہوں نے صحیح سمجھا ہے باقی تمام ائمہ و خلفائے راشدین و علمائے ملت نے غلطی کی ہے۔ بظاہر مؤلف نے قرآن کو بہ نفسِ نفیس سمجھنے کی کوشش نہیں فرمائی بلکہ عہدِ حاضر کے بعض احمقوں کے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے جس کے باعث وہ اہل الذکر کی تصریحات کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

مہلت دینے کی مصلحت

نہایت عجیب بات یہ ہے کہ مؤلف کتاب کی نظر ان جزوی اختلاف پر ہے جو توبہ کی مہلت کے بارے میں ہے۔ حالانکہ یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔ مرتدین کے کردار اور ذہنی صلاحیت کے اندازے کے مطابق مہلت دی جا سکتی ہے جس کی میعاد قرآن و حدیث کے احکامات سے فقہاء نے اخذ فرمائی ہے لیکن اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں ہے کہ مرتد مستوجب قتل ہے اس متفقہ فیصلہ کو جس کی حیثیت ایک اجماعی فیصلہ کی ہے، مؤلف موصوف نے کلیۃً نظر انداز فرما دیا ہے۔ ملت اسلامیہ کی تاریخ میں ایک نظیر بھی ایسی نہیں ہے کہ مرتد کو مستوجب سزائے موت نہ قرار دیا گیا ہو۔ آخر کیا وجہ ہے کہ امت کے اس متفقہ فیصلہ کو نظر انداز کر دیا جائے۔

النخعی پر الزام

مؤلف کتاب نے ایک جگہ درج فرمایا ہے ص۱۱۴ کہ اگر النخعی کے اس قول کو ترجیح دی جائے کہ توبہ کے لیے وقت کی کوئی حد مقرر نہیں ہے کیونکہ یہ قول قرآن کے عین مطابق ہے، اور سنت کے خلاف نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ مرتد پر نہ کوئی دباؤ ڈالا جا سکتا ہے اور نہ جرمِ ارتداد کی بنا پر اسے کوئی سزا دی جا سکتی ہے ہاں پند و نصائح سے اسے سمجھایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنا خیال بدل دے۔

مؤلف کتاب نے اس بیان سے چند امور ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ ایک تو یہ کہ نخعی نے توبہ کے لیے کوئی مدت مقرر نہیں کی حالانکہ اسی کتاب المغنی میں جس کا مؤلف نے حوالہ دیا ہے، مذکور ہے کہ مرتد کو تین دن تک اسلام لانے کے لیے کہا جائے اور اسے تنگ کیا جائے۔ اگر رجوع کرے تو بہتر ورنہ قتل کر دیا جائے۔ اس مسئلہ کے بارے میں بتایا ہے کہ اس حکم وجوب قتل میں مرد یا عورت کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ کیونکہ حضرات ابوبکر صدیق اور حضرت علیؓ کے ارشادات کے مطابق ہے اور اس سے حضرات حسن، زہری، نخعی، مکحول، حماد، مالک، لیث، اوزاعی، شافعی اور اسحاق سب کا اتفاق ہے۔ (المغنی ۱۲۳)

اس سے معلوم ہوا کہ النخعی بھی تحدید وقت کے قائل ہیں اور جناب مؤلف نے بلا تحقیق یہ تحریر فرمایا ہے کہ النخعی نے توبہ کے لیے کوئی مدت مقرر نہیں کی۔ یہ بھی ان کذب بیانیوں کی ایک مثال ہے جس کے ذمہ دار جناب مؤلف کے معاونین ہیں۔

دوسری بات یہ بتائی ہے کہ توبہ کے لیے تحدید وقت قرآن کے مطابق ہے، اور سنت کے خلاف نہیں ہے حالانکہ اس کی تردید بھی اسی کتاب میں کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ نخعی نے صرف یہ فرمایا ہے کہ یستتاب ابدا یعنی جب بھی کوئی شخص مرتد ہو اسے ہر بار توبہ کا موقع دینا چاہیئے۔ اس پر شیخ الاسلام بن قدامہ کو یہ اندیشہ ہے کہ اگر اس قول کو جوں کا توں مان لیا جائے تو مرتد ہمیشہ ہی قتل سے بچتا رہے گا۔

ان کی عبارت یہ ہے کہ:۔

وقال النخعی یستتاب ابدا وھذا یفضی الی ان لا یقتل ابدا و ھو مخالف للسنۃ والاجماع (المغنی ۳۷)

گویا در حقیقت نخعی تو اسی امر کے قائل ہیں کہ تین دن کے بعد اسے قتل کر دیا جائے اور ان کے اس قول کے تسلیم کرنے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ وہ کبھی نہ قتل ہو سکیں۔ حالانکہ یہ امر سنت اور اجماع کے خلاف ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ الاسلام کے اس قول کو مشتبہ

قرار دیتے ہیں اور اس کو خلاف سنت کہتے ہیں۔ لیکن جناب مؤلف کا ارشاد ہے کہ یہ سنت کے خلاف نہیں ہے۔ نیاز مند کے خیال میں سرے سے یہ قول ابراہیم النخعی کا ہے ہی نہیں بلکہ غالباً سلیمان بن یسار النخعی کا ہے جو عیر واضح ہے اور ابراہیم نخعی کا قول وہی ہے جو پہلے بتایا گیا ہے۔

تیسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ مرتد پر نہ کوئی دباؤ ڈالا جا سکتا ہے اور نہ بر امن ارتداد کی بنا پر اسے کوئی سزا دی جا سکتی ہے حالانکہ النخعی مرتد پر دباؤ ڈالنے کے بھی قائل ہیں جیسا کہ اسی کتاب میں جس کا مؤلف نے حوالہ دیا ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ النخعی دوسرے فقہاء کی طرح مرتد پر دباؤ ڈالنے کے بھی قائل ہیں (المغنی ص۳۳) الغرض مؤلف کتاب کا یہ ارشاد کہ النخعی جو امام ابو حنیفہ کے استاذ الاساتذہ میں سے تھے۔ ان کی قانونی رائے کا مطلب ابن قدامہ نے یہ لیا ہے کہ مرتد کو کبھی قتل نہیں کیا جائے گا۔ (ص۱۲۲) یہ خیال بھی سراسر خلاف حقیقت ہے کیونکہ ابن قدامہ ہی نے یہ بتایا ہے کہ دوسرے اصحاب کی طرح نخعی کی بھی یہی رائے تھی کہ تین دن کی مہلت توبہ کے بعد مرتد کو قتل کر دیا جائے گا۔ ابن قدامہ کی عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ مؤلف کتاب کے تصور کے خلاف مسلسل مہلت دینے کو خلاف سنت قرار دیتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک نخعی کے ارشاد کو کہ مرتد کی توبہ ہمیشہ قبول کی جاتی ہے، مشتبہ ہے لیکن فاضل مؤلف نے اسی قول کو معتبر تصور فرمایا اور جو معتبر قول تھا اسے نظر انداز کر دیا ہے۔

قتل مرتد پر فقہاء کے اتفاق کا سبب

مؤلف رسالہ نے اس سلسلہ میں سوال اٹھایا ہے کہ آخر اس کی کیا بنا ہے کہ بظاہر تمام فقہاء اس امر پر متفق ہیں کہ مرتد مستوجب قتل ہے؟

لفظ "بظاہر" استعمال فرما کر انہوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش فرمائی ہے کہ شاید تمام فقہاء درحقیقت اس عقیدہ کے خلاف ہیں اور بظاہر معترف ہیں۔ اس کا جواب انہوں

نے علامہ سمرائی کی ایک عبارت سے درج فرمایا ہے جس میں علامہ موصوف نے عقلی اور منطقی طور پر اس حکم کی حکمت بیان فرمائی ہے لیکن فقہاء کا اتفاق کبھی منطقی اور عقلی دلائل پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمیشہ کتاب وسنت اور اجماع امت کو اپنے خیالات کا محور قرار دیتے ہیں چنانچہ فقہاً کے ہر متفقہ قول کی بنیاد محض عقلی نظریات پر نہیں بلکہ نقلی دلائل پر مبنی ہوتی ہے۔ علامہ سمرائی نے بھی تمام کتاب میں قرآن و حدیث سے استنباط فرمایا ہے تاہم ان کے یہ عقلی دلائل احکام شرعیہ کی تائید میں ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ جرم ارتداد حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی خلاف ورزی ہے۔

" اگر کوئی مرتد دوبارہ اسلام اختیار کر لے تو اس کی جان بچ سکتی ہے۔ لیکن اگر اختیار کے بعد پھر جائے تو جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا کیوں کہ خدا جس نے جان بخشی ہے وہی جان لے بھی سکتا ہے۔"

مؤلفِ رسالہ فرماتے ہیں کہ یہ اصول اس جگہ منطبق نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو صحیح ہے کہ محض عقیدہ اسلام کے اظہار سے جان بچ سکتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ انکارِ اسلام سے زندگی جاتی رہتی ہے۔ حالانکہ سمرائی صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس امر کے اقرار سے حضورؐ نے جان کے تحفظ کا حکم دیا اس کے انکار سے قتل کا واجب ہونا بھی لازم ہے۔ چنانچہ اس کی تائید میں انہوں نے حضرت مقداد کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے جرم ارتداد کی پاداش میں ایک مرتد کا ہاتھ کاٹ دیا تھا۔ بعد میں اس نے اسلام قبول کر لیا اور حضورؐ سے جب اس کی بابت استفسار کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اب اس کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔

قتلِ مرتد کے عقلی دلائل

اس کے بعد قتل مرتد کی تائید میں السمرائی نے یہ دلیل بیان فرمائی کہ اسلام محض ایک مذہب نہیں بلکہ ایک قومیت ہے اور اس سے پھر جانا اس قومیت سے علیحدہ ہو جانا اور غداری کے مترادف اور ہم ملتی کے جذبے سے ہٹ کر دشمنی کا اقدام ہے اور مرتد شخص اسلام

سے پھر کر دوسروں پر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اسلام میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ گویا وہ دوسروں کو اسلام قبول کرنے سے روکتا ہے اور اس طرح اس کا جرم اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ دوسروں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر کوئی کافر اپنے عقیدۂ کفر پر قائم رہتا ہے تو لوگوں کی نظر میں وہ کسی نہ کسی طرح قابلِ نظر اندازی ہے لیکن اسلام لانے کے بعد اس سے پھر جانا ناقابلِ معافی قصور ہے کیونکہ جس نے روشنی نہیں دیکھی اس کا اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارنا قابلِ معافی ہے۔ اسلام کے بعد کفر اختیار کرنا دیدہ و دانستہ غلط راستے کا اختیار کرنا ہے۔ وہ اپنی جان کو خود تباہ کرنے کے درپے ہے جیسا کہ قرآن حکیم کی آیت سورۂ نساء میں ہے وغیرہ۔

مؤلفِ کتاب کی منطق

مؤلفِ محترم کا کہنا ہے کہ اس قسم کے دلائل موجودہ ذہن کو جو عقل کی روشنی سے منور ہیں مطمئن نہیں کر سکتے۔ حالانکہ اسلام دینِ فطرت ہے گویا جن اصحاب نے قرآن کا یہ مطلب سمجھا وہ عقل سے بے بہرہ ہیں۔ پھر ارشاد ہے کہ یہ کوئی معقول بات نہیں ہے کہ وہ شخص جس نے صحیح عقیدہ اختیار کیا اور پھر وہ شبہات میں مبتلا ہو گیا وہ اس سے بھی بڑا قصور وار متصور ہو گا جو مستقل طور پر کٹر کافر ہے۔

قابلِ غور ہے کہ مؤلفِ کتاب نے دین سے پھر جانے والے مرتد کا ذکر "محض شبہات میں مبتلا ہو جانے والے" کے الفاظ سے فرمایا ہے۔ ارتداد کی بدترین اور خوفناک معصیت کو محض شبہات میں مبتلا شخص کی حیثیت میں پیش کر کے اس جرم کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ وہ اس خیال کو نامعقول تصور فرماتے ہیں کہ جو شخص پہلے ہی سے مستقل طور پر کٹر کافر ہے ص ۱۱۶ اس کا جرم اس سے کم تصور کیا جائے جو مسلمان ہو کر اسلام سے پھر جائے یعنی مرتد شخص کافرِ اصلی سے کم قصوروار ہے۔ کاش! کوئی شخص ان سے یہ عرض کرنے کی جرأت کرے کہ ایک مرتد کا جرم ہزاروں لاکھوں کافروں کے جرم

کفر و شرک سے بڑھ کر ہے اور نمایاں تفاوت یہ ہے کہ کافر اصلی مبتلائے کفر و شرک ہونے کے باوجود غدار نہیں ہے لیکن مرتد کفر و شرک میں مبتلا ہونے کے علاوہ غداری کا بھی مرتکب ہے اسی لیے وہ عذابِ دنیا اور عذاب آخرت دونوں کا مستوجب ہے لیکن کافر عذابِ آخرت بھگتے گا وہ عذابِ دنیا سے بچ سکتا ہے، عذابِ آخرت سے نہیں بچ سکتا لیکن مرتد نہ عذابِ آخرت سے بچ سکتا ہے نہ عذابِ دنیا سے۔ اس جرم کی سنگینی کا احساس ان کو صرف اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب وہ کسی مسلمان کے کافر ہو جانے کی خبر پائیں یا ان کا اپنا کوئی عزیز نعوذ باللہ اسلام چھوڑ کر کافروں کا دین اختیار کرلے۔ کیا عراق کے اسلحہ والے طرزِ عمل نے ہمارے دلوں کو ہندوستان کے طرزِ عمل سے کہیں زیادہ المناک نہیں کیا اور کیا ایک شخص مجیب الرحمان کی پاکستان سے برگشتگی سورن سنگھ کی برگشتگی سے ہزار درجہ زیادہ حوصلہ شکن نہیں ہے؟ آخر ان حقائق سے کہاں تک آنکھیں بند کی جا سکتی ہیں۔ اگر مؤلف کتاب فی الواقع جرمِ ارتداد کو جرم کفر سے کمتر درجہ کا تصور فرماتے ہیں تو اس پر افسوس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال بھی جمہور ملتِ اسلامیہ کے عقیدہ کے خلاف ہے ایک مسلمان کا مرتد ہو جانا لاکھوں کافروں کے کفر سے بڑا جرم ہے۔

چنانچہ اگر ایک لاکھ کافر اس شرط پر مسلمان ہونے کو تیار ہوں کہ ایک مسلمان کو مرتد ہونے کی اجازت دی جائے تو شاید کسی مسلمان کو یہ گوارا نہ ہوگا۔

بہت بڑا اعتراض

مؤلف کتاب نے اپنی دانست میں ایک بہت بڑا اعتراض اس مسئلہ پر کیا ہے کہ "اگر کوئی شخص جبراً مسلمان بنایا جائے اور موقع پاکر وہ پھر کافر ہو جائے تو یہ ارتداد مستوجب قتل نہیں ہے"۔ مؤلف ممدوح کو یہ اعتراض ہے کہ یہی اصول فقہاء استتابہ کی صورت میں کیوں نہیں کار فرماتے۔ اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی کافر جبراً مسلمان بنایا جائے تو اسے اجازت ہے کہ وہ پھر کافر ہو جائے لیکن ایک مرتد کو جبراً مسلمان بنایا جائے تو

اسے اجازت نہیں ہے کہ وہ مرتد بن جائے مثلاً سخت حیرت ہے کہ آخر اس مسئلہ میں اصول کی یک جہتی کارفرمائی کو مؤلف کتاب جیسے منطقی فراست کے حامل نے کس طرح لہد یا کہ فقہاء نے مرتد کے بارے میں اصول کو نظر انداز کر دیا ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ جبراً کسی کا عقیدہ بدلا نہیں جا سکتا۔ اگر جبر سے کوئی اپنا مذہب بدل بھی لے تو حقیقتہً وہ اپنے پہلے ہی مذہب پر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اصحاب بصیرت نے آیت لا اکراہ فی الدین کے مفہوم میں کہا ہے کہ یہ حکم نہیں خبر ہے۔ اور مدعا یہ بتایا ہے کہ جبراً کوئی مسلمان بنا بھی لیا جائے تو وہ کافر ہی رہتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جس کو جبراً مسلمان بنایا جائے وہ پھر کافر ہو جائے تو اسے "ارتداد" نہیں سمجھا جائے گا اور اسی لیے مستوجب قتل بھی نہیں ہے۔ علامہ سرخسی کی منطق یہی ہے جس کا ذکر مؤلف کتاب نے کیا ہے۔ بالکل یہی اصول مرتد کے باب میں بھی ہے کہ اگر مرتد کو جبراً مسلمان بنا لیا جائے تو وہ مرتد ہی رہتا ہے لہذا اگر وہ پھر اسلام سے برگشتہ ہو جائے تو اسے مرتد تصور کیا جائے گا اور اس کے اس جبری اسلام کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔ چونکہ کافر کو قتل کرنے کا حکم نہیں ہے اسی لیے فقہاء نے کہا کہ جبری مسلمان کو مرتد ہونے پر قتل نہ کیا جائے اور مرتد جبری مسلمان ہو کر پھر مرتد ہو جائے تو اسے قتل کیا جائے۔ اس منطقی نتیجہ کو مؤلف کتاب نے یوں پیش فرمایا ہے کہ ایک شخص کو پھر کافر ہو جانے کی اجازت ہے اور دوسرے کو پھر مرتد ہو جانے کی اجازت نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں سے کسی کو بھی اجازت نہیں ہے۔ بتانا صرف یہ ہے کہ کافر جبراً مسلمان ہو تو کافر رہے گا اور مرتد جبراً مسلمان ہو تو مرتد رہے گا اور علامہ ممدوح نے آگے چل کر اس امر کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ کافر یا مرتد کو اگر جبراً مسلمان بنایا جائے تو اسے اس وقت تک مسلمان سمجھا جائے گا جب تک کہ وہ خوف و اندیشہ سے نجات پانے کے بعد بھی صحیح معنوں میں مسلمان رہے اور کافر یا مرتد نہ ہو جائے۔ اتنا کچھ کہنے کے بعد جناب مؤلف سے عرض ہے کہ وہ علامہ سرخسی کے خالص منطقی ارشادات اور اپنے قطعاً

غیر منطقی نظریات پر پھر غور فرمائیں تو امید ہے کہ انہیں خود اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔

علامہ سرخسی پر اعتراض

علامہ سرخسی پر مولفِ کتاب نے یہ اعتراض وارد فرمایا ہے کہ قرآن حکیم کی آیت ۱۷، سورہ فتح میں لفظ یسلمون کے معنے انہوں نے "یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو جائیں" کیے ہیں حالانکہ بیشتر مفسرین نے اس کے معنے "یہاں تک کہ وہ مطیع ہو جائیں" بتائے ہیں ص۱۱۵ مولفِ کتاب کو یہ اعتراض ہے کہ سرخسی کے نزدیک یہ آیت مرتدوں کے حق میں ہے حالانکہ یہ منافقین اعراب کے لیے ہے۔ اس گفتگو سے اگر کچھ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ علامہ سرخسی قتلِ مرتد کی سزا کے حامی تھے اور وہ اس کو قرآن کے مطابق تصور فرماتے ہیں۔ یہ کہاں سے نکلا کہ مرتد کا قصور قابلِ معافی ہے۔

مؤلفِ کتاب نے اس اختلافِ تفسیر کو بنیاد قرار دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ گویا قتلِ مرتد کے بارے میں علامہ سرخسی نے قرآن کی تفسیر غلط بیان کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود علامہ سرخسی نے اس آیت کے بارے میں یہ الفاظ درج فرمائے ہیں قیل الآیۃ فی المرتدین یعنی اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آیت مرتدین کے حق میں ہے۔ اس سے امام موصوف کا مقصد یہ ہے کہ بعض اصحاب اسے مرتدین کے حق میں خیال فرماتے ہیں اب جس کو وہ خود دوسروں کا قول خیال فرماتے ہیں۔ اس کو ان کی غلطی کے رنگ میں پیش کرنا کیا دیانت داری کے خلاف نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں علماء اسلام نے جو مرتد کو مستوجبِ قتل قرار دیا ہے مؤلف کتاب نے اپنے طویل بیان میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ یہ حکم قرآنِ حکیم کے حکم لا اکراہ فی الدین کے خلاف اور اس لیے قابلِ رد ہے لیکن اس تقریر کا تعلق قرآن کی آیت سے ہے۔ ہم کو اس باب میں صرف یہ بتانا چاہیئے تھا کہ فقہا کا کیا خیال ہے؟ مؤلفِ کتاب نے فقہاء کے خیال کی تردید فرمائی ہے اور ان کی تمام تقریر کا مدعا یہ ہے کہ فقہائے قرآن کو

غلط سمجھا لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ سب کے سب کس طرح غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ کتنا مشکل ہے یہ تسلیم کرنا کہ ہزاروں سال سے دینی فراست قرآنی احکام کے خلاف فیصلہ کرتی رہی اور کتنا آسان ہے یہ کہہ دینا کہ سب نے صحیح سمجھا صرف ایک شخص نے قرآن کو غلط سمجھا ہے

علامہ سرخسی پر ایک اور اعتراض

مؤلف کتاب نے علامہ سرخسی کا خیال مرتد عورت کے قتل کے بارے میں درج فرمایا ہے ص۱۲۳ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مرتد عورت جب تک تشدد پر نہ اتر آئے اسے قتل نہ کیا جائے بلکہ اسے قید و بند میں رکھا جائے۔ مؤلف موصوف صرف قتل مرتد ہی کے خلاف نہیں ہیں بلکہ قید و بند کے بھی خلاف ہیں اس لیے علامہ سرخسی کی بات انہیں پسند نہیں آئی اور اس خیال کو بھی قرآن کے خلاف فرمایا ہے۔ ان کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتد کے قتل کیے جانے کا سبب محاربہ ہے تو آخر امن پسند مرتد کو جو محاربہ نہیں کرتا کیوں قتل کیا جائے۔ یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ فاضل مؤلفِ کتاب نے فقہاء کے ارشاد کو نہیں سمجھا فقہاء کا کہنا یہ نہیں ہے کہ قتل کیے جانے کا سبب محاربہ ہے بلکہ فقہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہ کہا ہے کہ جس میں صلاحیت حرب و فساد نہ ہو اسے قتل نہ کیا جائے گا چونکہ عورت قتال کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی اس لیے اسے قتل نہ کیا جائے گا تاوقتیکہ وہ عملی طور پر قتال و فساد کی مرتکب نہ ہو۔ لیکن مرد میں چونکہ صلاحیت قتال و فساد ہے۔ اس لیے بمجرد ارتداد اس کا قتل واجب ہے خواہ عملی طور پر وہ محارب نہ ہو اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کے محض مرتد ہو جانے ہی کو مستوجب قتل قرار دیا ہے اور احکامِ خدا و رسول پر فقہی نقطہ نظر سے غور کیا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ حکمِ قتل مرتد سے عورت کو مستثنیٰ کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ مرتد مرد واجب القتل ہے عورت کا ارتداد مستوجبِ قتل نہیں تاہم وہ مستوجبِ تعزیر و حبس ہے اور انجام کار اسے بھی قتل کرنے کا حکم ہے۔

حیرت ہے کہ جناب مؤلف نے ان واضح بیانات کو نہ صرف نظر انداز فرمایا ہے بلکہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مرتد محض قابلِ بازپرس ہی نہیں ہے۔ بعرض جو احکام فقہائے اخذ فرمائے وہ قطعاً درست ہیں اور جو مؤلف نے سمجھا قطعاً غلط ہے

بودے دلائل

اس سلسلہ میں مزید دلائل انتہائی بودے ہیں مثلاً یہ کہ کسی کافر کو قتل کرنے کا حکم نہیں ہے جبتک کہ وہ عملی طور پر آمادہ حرب نہ ہو یا یہ کہ ابن دقیق کہتے ہیں کہ جو شخص نماز نہیں پڑھتا یا سرائی کہتے ہیں کہ جو شخص زکوٰۃ نہیں دیتا اسے قتل نہ کیا جائے گا ص۱۲۳ بلاشبہہ کسی کافر کو قتل کرنے کا حکم نہیں ہے۔ حتیٰ کہ کافر حربی کو بھی قتل کا حکم نہیں بلکہ اس سے قتال (یعنی جنگ) کا حکم ہے۔ اسے قید کیا جا سکتا ہے۔ خون بہا لے کر چھوڑا جا سکتا ہے۔ غلام بنایا جا سکتا ہے اور قتل بھی کیا جا سکتا ہے (قتل لازم نہیں ہے) لیکن یہاں ذکر مرتد کا ہے ایسا کوئی حکم نہیں ہے کہ مرتد کو قتل نہ کیا جائے بلکہ اسے جرمانہ لے کر چھوڑ دیا جائے یا غلام بنا لیا جائے تو کافی ہے۔ یہ خیال ذہن کی اس بنیادی غلطی کا نتیجہ ہے کہ کافر و مرتد دونوں کو ایک حیثیت دی گئی ہے۔

ابن دقیق اور سرائی کا یہ قول کہ بے نمازی یا زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے کو قتل نہ کیا جائے گا، بھی درست ہے کیونکہ اس نے بجاآوری احکامِ دین میں غلطی کی ہے۔ تارکِ دین نہیں ہے لہذا مرتد نہیں ہے۔ ان دلائل سے حکمِ قتلِ مرتد کی نفی نہیں ہوتی بلکہ تائید ہوتی ہے۔

فقہا کے نزدیک مرتد اور کافر میں فرق ہے۔

فقہاء کے نزدیک مرتد ہونا کفرِ اصلی سے بالکل مختلف اور دنیا و دین کا سب سے بڑا جرم ہے کیونکہ مرتد کافر بھی ہے غدار بھی لیکن کافرِ اصلی محض کافر ہے، غدار نہیں ہے اس لیے وہ کافر سے بالکل مختلف سلوک کا مستحق ہے۔ اس کی غداری کا ثبوت یہ ہے کہ دعوتِ اسلام اسے پہنچ چکی تھی اور اس نے اس دعوت کو تسلیم کر لیا تھا اور مسلمان ہونے کا عہد کیا۔ اس کے

بعد عہدِ اسلام سے پھر گیا اور دوسرے کفار کو یا تو دعوت ہی نہیں پہنچی یا دعوتِ اسلام کو انہوں نے تسلیم نہیں کیا لہٰذا وہ غدار نہیں ہیں۔

فقہاء کی بے جان دلیل

جنابِ مؤلف فرماتے ہیں کہ فقہاء کی یہ دلیل بے جان ہے اور اس کے بے جان ہونے کی ایک جاندار دلیل بزعم خود یہ دی ہے کہ متعدد غیر مسلم اہل علم جنہوں نے اپنی تمام عمر قرآن اور اسلامی عقاید کے مطالعہ و تحقیق میں صرف کی کیا ان کو دعوتِ اسلام نہیں پہنچی اور کیا انہوں نے مسلمان نہ ہو کر دین کی توہین نہیں کی، بعض غیر مسلم تبلیغی جماعتیں ایسی ہیں، جنہوں نے اسلام کے خلاف اتہامات بھی لگائے تو کیا وہ توہینِ الٰہی کی مجرم نہیں ہیں ص۱۲۵

حیران ہوں کہ آخر فاضل مؤلف جیسا ذی علم انسان ایسی غیر منطقی، اٹکل اور بے جوڑ باتیں کس طرح کر سکتا ہے؟

فقہاء کا کہنا تو یہ ہے کہ مسلمان ہو کر اسلام سے پھر جانا مستوجبِ قتل ہے اور جن غیر مسلموں کا ذکر مؤلف کتاب نے کیا ہے۔ ان میں سے کسی نے بھی مسلمان ہو کر اسلام سے پھر جانے کا جرم نہیں کیا۔ بلاشبہ اگر وہ دعوتِ اسلام کو تسلیم کر لیتے اور پھر کافر ہو جاتے تو خدا اور رسول کے نزدیک مستوجبِ قتل ہوتے۔ بصورت دیگر تمام دنیا کے غیر مسلم اور خود عہدِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے یہود و نصاریٰ جو اسلام کا نور اپنی آنکھوں سے پھیلتا دیکھ کر مسلمان نہ ہوئے۔ اسلامی حکومت میں ان سے کوئی باز پرس نہیں کی گئی حالانکہ انہوں نے دین کی توہین، اسلام سے دشمنی اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مذمت اور قتل و خونریزی کی سازشوں میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ان میں سے کسی کافر کو قتل کا حکم نہ تھا۔ ہاں جو مسلمان اسلام سے پھر جائے وہ مستوجب سزائے قتل ہے۔

مولانا مودودی کی تجویز پر اعتراض

اس سلسلہ میں انہوں نے مولانا مودودی کے اس نظریہ کی مخالفت کی ہے کہ اسلامی

مملکت میں کسی غیر مسلم کو اپنے عقاید کفریہ یا اسلام کے خلاف تبلیغی مہم انجام دینے کی اجازت نہ دی جائے گی ہاں وہ اپنے بچوں کو اپنے مذہب کی تعلیم دے سکتے ہیں۔ مؤلف کتاب کا کہنا ہے کہ یہ تو فسطائی نظام کی طرح ایک استبدادی یا کلیاتی نظام ہے جو قرآن اور حضور کی سنت کے خلاف ہے۔ یہ تمام باتیں بجز کتاب کا حجم بڑھانے کے اور کس مصرف کی نہیں بحث یہ ہے کہ اسلام سے پھر جانے کو خدا اور رسول نے جرم مستوجب سزائے موت قرار دیا ہے یا نہیں؟ ہاں یہ کہ غیر مسلم کو اسلامی حکومت میں اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے اور اس کے تبلیغ و اشاعت کی کس حد تک اجازت ہے۔ یہ دنیا جانتی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ غالباً کسی بھی مملکت کو مذہب کی وہ آزادی جو اسلام نے غیر مسلموں کو دے رکھی ہے، میسر نہیں ہے اور صرف مرتد سزائے قتل کا مستحق ہے۔

فقہائے متقدمین و متاخرین

اس قسم کے بے تعلق دلائل کے بعد انہوں نے یہ نتیجہ اخذ فرمایا ہے کہ فقہائے متقدمین (صفحہ ۱۳۸) کی تحریروں میں محض مرتد ہو جانے اور معاندانہ جنگ و جدل میں شامل ہو جانے والے مرتدوں کے درمیان فرق نہیں رکھا گیا اور کچھ عرصہ کے بعد اس حکم میں یہ سختی آگئی کہ جو مرتد توبہ نہ کرے اسے قتل کر دیا جائے (صفحہ ۱۴۲)۔ فقہائے متقدمین کا لفظ استعمال فرما کر انہوں نے اس امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ فقہائے متاخرین کی تحریروں میں اس کے خلاف مرتدین کو سزا نہیں دی گئی۔ فقہائے متقدمین و متاخرین میں سے کسی نے بھی امن پسند اور جنگجو مرتد کی تقسیم نہیں کی بلکہ بعض فقہاء کی تحقیق یہ ہے کہ مرتد جنگجو (حربی) ہو جائے تو واجب القتل نہیں رہتا تاہم انہیں ڈاکٹر عبدالحکیم کی ایک تحریر ہاتھ لگی ہے جو اسکندریہ یونیورسٹی میں قانون کے استاذ ہیں۔ اس تحریر میں ڈاکٹر موصوف نے بتایا ہے کہ جو اصحاب مرتد کو مستوجب سزائے موت سمجھتے ہیں وہ ارتداد کو جرائم کی حدود میں شمار نہیں کرتے بلکہ جرائم تعزیریہ میں شمار کرتے ہیں اور دونوں کا فرق یہ بتایا ہے کہ جرائم حدود تو وہ ہیں جن کے

سزائیں پہلے سے متعین ہیں لیکن جرائم تعزیر یہ وہ ہیں جن کی سزائیں جرم کی نوعیت کے مطابق حکومت مقرر کرتی ہے اور وہ قتل کے سوا تمام سزائیں ہیں۔ ص۱۲۵

ہمیں افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کتاب "مبادی نظام الحکم فی الاسلام" جس کا حوالہ دیا گیا ہے موجود نہیں ہے لیکن دل کہتا ہے کہ مولف نے جس طرح ہمارے بعض مفسرین اور فقہاء کی عبارت کے سمجھنے میں غلطی کی ہے ان کے بیان کو سمجھنے میں بھی غلطی کی ہے۔ تاہم ڈاکٹر صاحب بھی ارتداد کو جرم قابل تعزیر سمجھتے ہیں اور وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ اس دنیا میں اس کی کوئی سزا نہیں ہے جیسا کہ متعدد مقامات پر جناب مؤلف نے اپنے خیال کا اظہار فرمایا ہے۔ میرے خیال میں ارتداد کا جرم قابل تعزیر ہونا بھی آزادی ضمیر وغیرہ مزخرفات کے منافی ہے۔ جناب مولف کتاب کی اس باب میں کیا رائے ہوگی۔ واللہ اعلم

فقہاء پر افسوسناک الزام

اس سے زیادہ افسوسناک وہ الزام ہے جو جناب مؤلف نے فقہاء پر بلا سبب لگایا ہے کہ "فقہا گو بظاہر تقریباً متفقہ نظریہ پر جمے ہوئے ہیں کہ ارتداد کی سزا موت ہے" تاہم اس سزا کے موافق عقل ہونے میں ان کی رائیں مختلف ہیں۔ وہ بالواسطہ یا بلا واسطہ یہ مانتے ہیں کہ مرتدوں کے ساتھ سختی کا اصل موجب اسلام کے خلاف معاندانہ سرگرمی ہے"

حقیقت یہ ہے کہ فقہاء پر یہ سب سے بڑا اتہام ہے اور اس میں الفاظ "بظاہر" اور "تقریباً متفقہ" کذب بیانی کی حد تک خلاف واقعہ ہیں کیونکہ قتل مرتد کے باب میں فقہا کا کوئی فیصلہ "بظاہر" کی بنیاد پر نہیں ہے۔ یہ ہزاروں فقہائے اسلام کی یقینی اور کتاب وسنت کے دلائل سے اخذ کردہ قطعی رائے ہے۔ حقیقت کو چھپا کر بظاہر کچھ کہنا عین منافقت ہے۔ جناب مؤلف نے اپنے فقہاء پر یہ الزام لگا کر ظلم کیا ہے اور یہ جو ارشاد ہوا کہ یہ ان کا تقریباً متفقہ فیصلہ ہے یہ صریحاً خلاف واقعہ ہے۔ فقہاء کا یہ فیصلہ متفقہ ہے۔ "تقریباً متفقہ" کہنا حق پوشی ہے کیوں کہ ایک فقیہہ بھی اس کے خلاف نہیں ہے۔

مؤلف کتاب کی کذب بیانی

مولفِ کتاب نے علامہ ابن حیان اندسی۔ علامہ شلتوت حلبی اور ابن ہمام پر خاص طور سے یہ الزام لگایا ہے کہ ان کے نزدیک ارتداد کی سزا کے قتل انصاف پر مبنی نہیں یا یہ کہ مرتد کو اس دنیا میں کوئی سزا نہیں ص۱۳۴ ان حضرات پر یہ الزام قطعاً جھوٹ ہے۔ تفصیل آگے آئے گی

قتل مرتد کے باب میں ملتِ اسلامیہ کا متفقہ فیصلہ

کتاب زیرِ نظر کا چوتھا باب کتاب کے خلاصے اور مؤلف کے اخذ کردہ نتیجہ پر مشتمل ہے۔ اس پر تبصرہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قتل مرتد کے باب میں ملت اسلامیہ کا جو متفقہ فیصلہ ہے۔ یہاں پر اس کو اجمالاً درج کیا جائے۔ اس کے لیے علامہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب مبسوط ج ۹ ص۹۸ و مابعد ملاحظہ ہو:

"جب کوئی مسلمان اپنے دین سے پھر جائے (یا مرتد ہو جائے) تو اسے پھر مسلمان ہونے کے لیے کہا جائے اگر اسلام لے آئے تو فبہا ورنہ اسی جگہ قتل کر دیا جائے۔ ہاں اگر وہ (غور و فکر کے لیے) کچھ مہلت مانگے تو اسے تین دن کی مہلت دے دی جائے گی قتل مرتد کے واجب ہونے کی بنیاد قرآن حکیم کی آیت "او یسلمون الایۃ" پر ہے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ یہ آیت مرتدین کے حق میں ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ من بدل دینہ فاقتلوہ (یعنی اے مسلمانو! جو کوئی اپنا دین بدل دے اسے قتل کر دو) اور حضرت علی، ابن مسعود، معاذ اور دوسرے اصحاب رضی اللہ عنہم سے یہ اثر ثابت ہے کہ انہوں نے جرم ارتداد کی پاداش میں مرتد کو قتل کیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مرتد مشرکین عرب کی مانند بلکہ ان سے زیادہ سخت جرم کے مرتکب ہیں .... اور جس طرح مشرکین عرب کے لیے دو ہی راستے ہیں یا اسلام یا تلوار۔ اسی طرح مرتدین کے لیے بھی یہی دو

واستے ہیں۔ ہاں اگر وہ (غور وفکر کے لیے) کچھ مہلت طلب کرے تو اتنی مہلت اسے دے دی جائے کیوں کہ بظاہر ممکن ہے کہ وہ کسی شبہ کا شکار ہو کر مرتد ہو گیا ہو۔ اس صورت میں ہمیں چاہیئے کہ اس کے شبہ کا ازالہ کریں یا ممکن ہے کہ وہ اس بارے میں غور فکر کرنا چاہتا ہو تاکہ حقیقت اس پر روشن ہو جائے۔ ... کے لیے مہلت درکار ہے لہذا اگر وہ اس کے لیے مہلت مانگے تو امام المسلمین کو چاہیئے کہ وہ مہلت دے دے جس کی شرعی مدت تین دن ہے جیسا کہ شرط خیار (شرط پسندیدگی کے سودے) میں ہوتا ہے اس سے زیادہ مہلت نہ دی جائے گی۔ اگر اس سے زیادہ مہلت کا طالب ہو تو فوراً قتل کر دیا جائے۔ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہا اللہ فرماتے ہیں کہ مرتد کو تین دن کی مہلت دینا اس کی درخواست کے بغیر بھی مستحب ہے اور امام شافعیؒ تین دن کی مہلت واجب قرار دیتے ہیں اور اس سے پہلے قتل کرنا منع فرماتے ہیں اور اس کے ثبوت میں وہ ایک روایت پیش کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کو کسی نے بتایا کہ فلاں شخص ایمان لانے کے بعد پھر کافر ہو گیا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ تم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تو اس نے کہا ہم نے اس کی گردن مار دی۔ ارشاد ہوا کہ ارے تم نے اسے تین دن تک بند کر کے کیوں نہ رکھا۔ ہر روز روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال دیا کرتے شاید وہ توبہ کر لیتا۔ اور حق کی طرف لوٹ آتا۔ پھر آپ نے اپنا سر اٹھایا اور جناب ایزدی میں عرض کیا کہ میں وہاں موجود نہ تھا اور اس بات کو سن کر میں خوش بھی نہیں۔ ایک اور روایت میں اس واقعہ کا ذکر ہے کہ حضرت ممدوح نے فرمایا کہ جس طرح تم حاکم تھے اگر میں وہاں کا حاکم ہوتا تو اسے تین دن کی مہلت دیتا۔ توبہ کر لیتا تو خیر ورنہ اسے قتل کر دیتا۔

اس بارے میں فقہا کا تفکر یہ ہے کہ وہ ابتدائے اسلام کا عہد تھا۔ لوگ اچھی طرح اسلام سے واقف نہ ہوئے تھے۔ بسا اوقات شبہہ میں مبتلا ہو جاتے اور پھر وہ شبہہ دور ہو جاتا تھا۔ ایسی صورت میں اس وقت مہلت اور توبہ کرنے کا موقع نہ دینا بری بات تھی لیکن ہمارے زمانہ میں دین مستحکم اور حق واضح ہو گیا ہے اب ایمان کے بعد شرک اختیار کرنا یا تو عمداً جرم کا ارتکاب ہوگا یا شبہہ کے باعث ہوگا جس کی علامت یہ ہے کہ کوئی مرتد اگر مہلت کا طالب نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ جرم پر آمادہ ہے تو اسے قتل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تاہم مستحب یہی ہے کہ اسے توبہ کی ترغیب دی جائے۔ یہ ترغیب واجب نہیں ہے۔ توبہ کرنے کے بعد اسے رہا کر دیا جائے گا اور توبہ یہ ہے کہ وہ کلمہ شہادت ادا کرے اور اسلام کے سوا جملہ مذاہب سے بیزاری کا اعلان کرے اور جس دین کو اس نے ترک اسلام کے بعد اختیار کیا تھا اس سے بریت کا اظہار کرے۔

اگر ایسی حرکت وہ دوسری اور تیسری بار بھی کرے تو ہر بار اس سے ایسا ہی سلوک روا رکھا جائے اور جب بھی وہ اسلام لے آئے اسے آزاد کر دیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ (یعنی اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز پر پابند ہو جائیں اور زکوٰۃ دیں تو ان کو چھوڑ دو) اس بارے میں حضرت علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی رائے یہ ہے کہ اگر چوتھی بار بھی کوئی ایسی ہی حرکت کرے تو اس کی توبہ قبول نہ کی جائے بلکہ بہرحال قتل کر دیا جائے کیونکہ اس کی اس حرکت سے عیاں ہے کہ وہ شخص (اسلام کی) توہین کرنے اور مذاق اڑانے پر آمادہ ہے اور حقیقی معنوں میں (توبہ پر آمادہ نہیں ہے اور

اس کا ثبوت وہ قرآن کی اس آیت سے دیتے ہیں اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ ہمارا (یعنی حنفیہ کا) کہنا یہ ہے کہ یہ آیت اس کے لیے ہے جو کفر میں بہت زیادہ بڑھ جائے اس کے لیے نہیں ہے جو ایمان لائے اور توبہ وخشوع سے کام لے اس کی حالت چوتھی بار بھی ویسی ہی متصور ہو گی جیسی کہ پہلے بار تھی لہٰذا اسلام لائے تو اس کا قبول کر لینا واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو شخص تمہیں سلام کرے اسے بھی یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہیں ایک مشرک پر غصہ آیا، اس نے لا الٰہ الا اللہ کہا انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ارے تم نے ایسے کو قتل کیا جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا۔ جنابِ الٰہی میں کیا جواب دو گے؟ انہوں نے کہا یہ تو اس نے اپنی جان بچانے کے لیے کہا تھا۔ ارشاد ہوا ھلا شققت عن قلبہ (یعنی کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا) انہوں نے کہا کہ اگر ایسا کرتا بھی تو مجھے پتہ نہ چلتا۔ ارشاد ہوا لیکن دل کی بات تو زبان ہی سے بتائی جا سکتی ہے۔ لیکن نوادر میں یہ آیا ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی حرکت کرے (کہ بار بار مسلمان ہوا اور توبہ کرے) تو اظہار ناپسندیدگی کے طور پر اس قصور کی سزا دی جائے اور اسے قید میں رکھا جائے یہاں تک کہ وہ توبہ اور عاجزی کا اظہار کرے۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ایسی حرکت بار بار کرے تو اسے شبہہ میں قتل کر دینا چاہیئے یعنی اتنا انتظار کرنا چاہیئے کہ کلمۂ شرک اس سے ظاہر ہو تو توبہ کے لیے کہنے سے پہلے ہی اسے قتل کر دیا جائے کیوں کہ اس نے ایسا کر کے (اسلام کی)

توہین کی ہے اور ایسا کافر جسے توبہ کی تلقین سے پہلے اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہو، قتل کر دینا جائز ہے اور مرتد جب مسلمان ہونے سے انکار کرے اسے قتل کر دیا جائے۔"

علامہ سرخسی کی اس عبارت سے واضح ہے کہ اس حکم کا ماخذ قرآن، حدیث، تعامل خلفائے راشدین وجملہ فقہا وعلمائے ملت ہیں۔ تحقیق کرنے سے معلوم ہوگا کہ مرتد کے واجب القتل ہونے میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہے جسے اس اجماعی فیصلہ سے اختلاف ہو۔ چنانچہ علامہ موفق الدین بن قدامہ المتوفی سنہ ۶۲۰ھ فرماتے ہیں کہ:۔

"مرتدوہ ہے جو دین اسلام سے مڑ کر کفر کی جانب چلا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے (وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ) وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من بدل دینہ فاقتلوہ اور تمام اہل علم قتل مرتد کے واجب ہونے پر متفق ہیں اور اس حدیث کو (خلفائے راشدین میں سے ہر ایک یعنی) حضرت ابوبکرؓ عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، معاذؓ، ابوموسیٰؓ، ابن عباسؓ اور خالدؓ وغیرہم نے روایت کیا ہے اور کسی نے اس سے انکار نہیں کیا لہٰذا اس پر اجماع ہے۔"

(کتاب المغنی والشرح الکبیر ج ۱۰ ص ۷۴) ۔

غرض گزشتہ تیرہ سو سال کی تاریخ ملت اسلامیہ میں کہیں ایک واقعہ بھی ایسا مذکور نہیں ہے کہ اسلام سے پھر جانے والے کو مجرم مستوجب قتل نہ گردانا گیا ہو اور اس عہد میں بھی کسی نظریاتی مملکت میں نظریۂ مملکت سے بغاوت کو ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اشتراکی نظریہ کی بنیاد پر قائم ہونے والی حکومتیں عہد حاضر میں تاریخ اقتدار کی مستحکم ترین حکومتیں تصور کی جاتی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عمال حکومت میں ایک معمولی

درجے کے چپراسی سے لے کر صدر مملکت تک کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں ہے جو اشتراکی نظریہ کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکے کیونکہ نظریہ کے اس اختلاف کی سزا قتل ہے یا جلا وطنی۔

ملک کی سلامتی کے لیے نظریہ مملکت سے ہم آہنگی ضروری ہے

حقیقت یہ ہے کہ کوئی حکومت پائدار بنیادوں پر استوار ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اربابِ بست و کشاد کے درمیان نظریہ حکومت کے باب میں ہم آہنگی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ بے نظیر اور ناقابل انکار رواداری کی انتہائی منزل پر پہنچنے کے باوجود بھی کسی مسلمان کا اسلامی نظریہ سے بغاوت کرنا گوارا نہیں کر سکتی اور یہ قطعاً ناممکن ہے کہ کسی شخص کو اپنے اس عہد کو توڑ دینے کی اجازت دی جائے جو اس نے اسلامی نظریہ سے جوڑ لیا ہے۔

اسلامی حکومت لاکھوں غیر مسلموں کو اپنے قلمرو میں پوری آزادی کے ساتھ رہنے کی اجازت تو دے سکتی ہے لیکن ایک فردِ مسلم کو بھی ترکِ اسلام کی اجازت نہیں دے سکتی ملتِ برحق کے نزدیک ایک فردِ مسلم کا ایمان ہزاروں مسلمانوں کی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ گویا اسلام سے پھر جانا ایک ایسا جرم ہے جس سے بڑا کوئی جرم نہیں ہے لیکن جناب مؤلف کتاب نے تمام ملتِ اسلامیہ کے متفقہ فیصلہ کے خلاف اس کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان کا معاذ اللہ اسلام سے برگشتہ ہو جانا ایسا جرم نہیں ہے جو قابلِ سزا ہو۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جن دلائل کا سہارا پکڑا ہے ان میں سے کوئی دلیل بھی منطق، دیانت اور عقل کے مطابق نہیں ہے۔

مؤلف کی پہلی غلطی

پہلی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے آیت لا اکراہ فی الدین کے نہ معنے سمجھے نہ سمجھنے کی کوشش فرمائی۔ اس میں کہا گیا ہے کہ دین کے باب میں کوئی جبر نہیں ہے یعنی کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا جا سکتا۔ چونکہ یہاں سرے سے کسی کو جبراً مسلمان بنانے کا ذکر نہیں بلکہ

اسلام سے پھر جانے کی سزا کا مسئلہ ہے اس لیے خواہ مخواہ اس آیت کو جرم ارتداد پر منطبق کرنا صحیح نہیں ہے اس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے۔ قرآن حکیم کی آیات اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی جس قدر بھی احادیث پیش کی گئی ہیں[۱۳۰] ان سب کا واضح مقصد یہ ہے کہ کسی پر مذہب اسلام قبول کرنے کے لیے جبر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کہیں بھی نہیں ہے کہ کوئی جرم کرے تو اسے سزا نہ دی جائے۔ مرتد کو سزائے قتل اس کے جرم ارتداد کی پاداش میں اسی طرح دی جاتی ہے جس طرح قاتل کو قتلِ ناحق کی پاداش میں اور یا زانی محصن کو زنا کی پاداش میں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی ارشاد ہے۔ مؤلفِ کتاب کی غلطی کا ثبوت واضح یہ ہے کہ انہوں نے جو مفہوم اپنی طرف سے نکالا ہے لغۃً، اصطلاحاً اور عقلاً کسی مفسر کے قول سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ اکراہ کے معنے کسی برائی پر مجبور کرنے کے ہیں اور مرتد کا قتل کسی برائی پر مجبور کرنے کے لیے نہیں ہے۔

مؤلف کی دوسری غلطی

مؤلف کی دوسری غلطی یہ فرمانا ہے کہ قرآن میں قطعاً اسلام سے پھر جانے کی سزا مذکور نہیں ہے ص۱۳۱ مرتد کی سزا قرآن کی دلالۃ النص سے اسی طرح ثابت ہے جس طرح قتلِ ناحق کی سزا بہ دلالۃ النص ثابت ہے۔ متعدد مفسرین نے اس کی توثیق کی ہے۔

دوسری غلط بیانی

مؤلفِ کتاب کا یہ کتنا غلط بیانی پر مبنی ہے کہ بعض نظائر ایسی ہیں کہ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ارتداد کی انتہائی سزا (موت) مرتد کو نہیں دی گئی۔ تمام کتاب میں کوئی ایک نظیر بھی ایسی نہیں بتائی گئی، صرف توبہ کرنے والوں کو معاف کیا گیا ہے حالتِ ارتداد میں کوئی مرتد سزائے موت سے نہیں بچا (ایسا کہنا صریح کذب بیانی ہے)

تیسری غلط بیانی

تیسری کذب بیانی یہ ہے کہ فقہاء بالعموم اقرار کرتے ہیں کہ قرآن میں ارتداد کی سزا کوئی

نہیں بتائی گئی۔ ان کا سب سے زیادہ انحصار چند قولی احادیث پر ہے جس کی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ ارتداد جرم مستوجب سزا ہے۔"

فقہائے نے مرتد کی سزائے موت کا استنباط قرآن ہی سے کیا ہے اور محض قولی احادیث پر انحصار نہیں بلکہ عملی احادیث پر ہے جن کا ذکر خود مؤلف نے بھی کیا ہے اور چند احادیث نہیں بلکہ متعدد احادیث ہیں اور حدیث قتلِ مرتد کے راویوں کی تعداد اتنی ہے جتنی بہت کم احادیث کی ہیں۔

چوتھی غلط بیانی

یہ کہنا بھی غلط ہے کہ قتلِ مرتد کی احادیث کے متعلقہ مواقع اور حالات کا پس منظر نہیں بتایا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت کم ایسی احادیث ہیں جن میں احکام اسلامی کا اتنا واضح پس منظر بیان کیا گیا ہو جتنا کہ قتلِ مرتد کی احادیث میں ہے۔

مؤلف کی چوتھی غلطی

۱۴۷-۱۴۳

مؤلف کی چوتھی غلطی یہ ہے کہ وہ حرب یا محاربہ کو سزائے قتل کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اسلامی سیاسیات کی تاریخ پر مجموعی نظر ڈالنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اہلِ حرب سے قتال کا حکم ہے قتل کا حکم مخصوص ہے مجرموں کے لیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف تین اشخاص کو مجرم واجب القتل قرار دیا ہے۔ ناحق قتل کرنیوالا، زانی محصن اور مرتد۔ باقی اہلِ حرب خواہ کوئی بھی ہو۔ اسے قتل نہیں، بلکہ اس سے قتال کا حکم ہے حتی کہ مرتد بھی اگر حربی ہو جائے تو اس سے قتال کا حکم ہے عجب نہیں کہ بعض صورتوں میں اسے کافرِ حربی کی حیثیت سے گرفتاری کے بعد زندہ رکھا جائے، امان دی جائے یا غلام بنالیا جائے۔ لیکن محض ارتداد ایک جرم مستوجب قتل ہے۔ صرف توبہ ہی اس کی جان بچا سکتی ہے۔

کذب بیانی کی انتہائی افسوسناک صورت

کذب بیانی کی انتہائی افسوسناک نظائر میں مؤلف کا مفسرین متقدمین میں سے

ابن حیان اندلسی اور فقہائے عہد حاضر میں سے شیخ محمد شلتوت کے باب میں یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ان دونوں اصحاب نے "واضح طور پر" یہ کہا ہے کہ اگر کوئی شخص اسلام سے پھر جائے تو محض تبدیلیٔ مذہب کی بنا پر اس کا قتل کرنا انصاف کے خلاف ہے۔ ص۱۳۴

حسن اتفاق سے ان دونوں اصحاب کی تصانیف میرے سامنے ہیں۔ ابن حیان اندلسی کی بسوط تفسیر موسومہ بحر المحیط میں آیت سورۂ بقرہ .... مَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَیَمُتْ وَهُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ کے تحت لکھا ہے:

"اس آیت میں دین سے مراد اسلام ہے کیونکہ یہ مسلمانوں سے خطاب ہے اور مرتب علیه حبوط الدنیا کا مطلب ہے هو حبطه باستحقاق قتله یعنی جو مسلمان اسلام سے پھر کر مر جائے اس کی دنیا بھی حبط ہوئی اور آخرت بھی اور حبطِ دنیا کے معنے یہ ہیں کہ وہ قتل کا مستوجب ہوگا۔" (ج ۲ ص۱۵۱)

پھر حاشیہ پر بھی انہی کی یہ عبارت درج ہے:

"حبوط العمل فی الدنیا هو بطلانه فی الدنیا باستحقاق قتله یعنی اس آیت میں حبوط العمل فی الدنیا کا مطلب یہ ہے کہ وہ واجب القتل ہے۔"

ظاہر ہے کہ ابن حیان کا فتوائے قتل مرتد جو انہوں نے قرآن سے اخذ فرمایا ہے اس سے زیادہ واضح الفاظ میں ممکن نہیں۔

فاضل مؤلف نے ابن حیان اندلسی پر یہی الزام اپنی کتاب کے ص۱۲۳ پر بھی لگایا ہے کہ علامہ ممدوح نے اپنی تفسیر بحر المحیط میں لا اکراہ فی الدین کے تحت لکھا ہے کہ اس آیت کی ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ:

"ایک شخص جو اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے اسے دوبارہ مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔"

یہ بھی غلط بیانی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مؤلفِ کتاب نے ابن حیان کی عبارت کو

سمجھنے کی کوشش ہی نہیں فرمائی۔ ظاہر ہے کہ جو شخص از روئے قرآن مرتد کو واجب القتل سمجھتا ہو جیسا کہ بوضاحت اوپر بتایا گیا وہ ایسی لغو بات کہہ کیسے سکتا ہے۔ ابن حیان کا کہنا یہ ہے کہ اس آیت کا بیشتر سبب نزول یہ بتایا گیا ہے کہ انصار مدینہ کی بعض اولاد عیسائی یا یہودی بن گئی۔ ان کے والدین نے انہیں مسلمان ہو جانے پر مجبور کیا حضور نے اس جبر سے منع فرمایا۔ اور آگے چل کر لکھا ہے قیل لا یکرہ علی الاسلام من خرج الیٰ غیرہ کہ اگر کوئی شخص (اسلام کے سوا) کسی اور دین کی طرف نکل جائے تو اسے جبراً اسلام میں نہ لایا جائے جناب مؤلف نے اس کا ترجمہ غلط کیا ہے کہ

"a person who forsakes Islam for another religion can not be compelled to revert to Islam."

یعنی جو شخص مرتد ہو جائے یا کوئی اور دین اختیار کرلے اسے دوبارہ اسلام لانے پر مجبور نہ کیا جائے۔

یہاں مرتد ہونے کا ذکر ہی نہیں۔ لا یکرہ علی الاسلام کے معنے یہ ہیں کہ مسلمان ہونے پر مجبور نہ کیا جائے اور یہ اشارہ ان لڑکوں کی طرف ہے جو ماں باپ کے مسلمان ہونے کے بعد خود عیسائی یا یہودی ہو گئے۔ پھر اس کے ساتھ قائل (نامعلوم) کے اس خیال کی وجہ بتائی ہے کہ اگر ایسا کیا گیا تو اس دنیا کے دار الابتلاء ہونے کا تصور جاتا رہے گا۔ یہ دوسری کذب بیانی ہے کیونکہ یہ خیال اس نامعلوم قائل کا نہیں ہے بلکہ یہ توجیہ ابومسلم اور قفال کی ہے قطع نظر ان تمام خلاف بیانیوں کے، کیا یہ امر باعث تعجب نہیں ہے کہ مؤلف نے واضح نصوص کے خلاف ایک ایسے قول پر زندگی اور موت جیسے اہم مسئلہ کی بنیاد رکھی ہے جس کے کہنے والے کا نام معلوم نہیں اور قائل خود اسے غیر معتبر تصور کرتا ہے۔ ایک گمنام شاہد کا بیان جسے اچھی طرح وہ خود بھی نہیں سمجھے آخر کیسے ہوا کہ اس پر انہوں نے ایسے اہم مسئلہ کی بنیاد رکھ دی۔ یہ بنائے فاسد علی الفاسد ہے۔

اب امام اکبر محمود شلتوت کو لیجئے۔ ملتِ اسلامیہ کے مستند علماء کو علامہ شلتوت کے بعض خیالات سے اتفاق نہیں ہے۔ نہ امورِ دینیہ میں ان کی رائے وقیع تصور کی جاتی ہے اور نہ ان کو فقہاء میں شمار کیا گیا ہے تاہم اس باب میں کہ مرتد کی سزا قتل ہے وہ بھی تمام علماء سے متفق ہیں چنانچہ ان کی کتاب الفتاویٰ کے صفحہ ۲۰۱-۱۹۱ پر یہ مرقوم ہے کہ:۔

"تمام اہلِ اسلام اس امر پر متفق ہیں کہ جو شخص اسلام کے فرائض اور ارکان میں سے کسی کے وجوب کا منکر ہو وہ خارج از اسلام ہے وحکمہ حکم المرتدین (یعنی اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو مرتدین کے ساتھ ہوتا ہے۔)

آگے کی عبارت یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ مرتد کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ:۔

"نماز میں غفلت کرنے والے کے متعلق تین خیالات ہیں:۔

ایک تو یہ کہ اسے اسلام سے خارج تصور کیا جائے گا اور اسے مرتد کی طرح قتل کیا جائے گا۔

دوسرے یہ کہ اسے اسلام سے خارج تصور نہ کیا جائے گا تاہم یجب قتلہ حدّا اذا لم یتب و یصل کقاتل النفس بغیر حق (یعنی اگر وہ توبہ نہ کرے اور نماز نہ پڑھے تو اسے ناحق قتل کے مرتکب کی طرح حدّ کے طور پر قتل کیا جائے گا۔

تیسرا خیال یہ ہے کہ نہ تو اسے اسلام سے خارج سمجھا جائے گا اور نہ بطور حدِ شرعی اسے قتل کیا جائے گا بلکہ ایسے شخص کو ضرب اور قید کی سزا دی جائے گی تا آنکہ وہ نماز پڑھنے لگے"۔

اس کے بعد علامہ شلتوت نے اس تیسرے مسلک کو قرینِ صواب بتایا ہے کہ لاکفر ولا قتل (یعنی نماز میں غفلت کرنے والے پر نہ کفر عاید ہوتا ہے، نہ اس کا قتل لازم ہے البتہ ضرب اور حبس کا مستوجب ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین صورتوں کے علاوہ

کسی مسلمان کا خون حلال نہیں فرمایا یعنی جو مسلمان ہو کر کافر ہو جائے اور جو شادی شدہ بدکاری کرے اور جو ناحق کسی کو قتل کرے۔

ان دونوں اصحاب کے اس فیصلہ کو دیکھ کر کہ دونوں مرتد کی سزا قتل قرار دیتے ہیں، جب ہم فاضل مؤلف کتاب کی یہ عبارت پڑھتے ہیں:۔

"At least one old exegetist, Abu-i-Hayyan Andalusi-and one modern jurist Sheikh Mohammad Shaltut have laid down expressly the principle that shedding of a person's blood is not justifiable for simple peaceful apostasy."

"یعنی ابن حیان اور علامہ شلتوت نے محض ارتداد کی سزا قتل کو واضح طور پر غیر منصفانہ بتایا ہے۔"

تو سخت حیرت ہوتی ہے کیونکہ ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ ایک عظیم المرتبت فاضل مصنف کذب بیانی سے کام لے گا۔ بظاہر بعض معاندین نے انہیں دھوکے میں ڈالا اور غلط حوالے دے کر فاضل مؤلف کی توہین کی ہے۔

"اس کے ساتھ ہی یہ جو ارشاد فرمایا گیا ہے کہ بظاہر چلپی اور ابن الہمام بھی اس خیال سے متفق ہیں کیونکہ ان اصحاب کے خیال میں ارتداد کی کوئی سزا اس دنیا میں نہیں ہے"

یہ ارشاد بھی امر واقعہ کے خلاف اور صریحاً کذب بیانی ہے کیونکہ اسکے برعکس ہر دو اصحاب نے نہایت وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے ہاں توبہ کے لیے کچھ مہلت کی اجازت دی ہے اور لکھا ہے کہ:۔

"ان قتلہ قاتل قبل عرض الاسلام کرہ ولا شیء علی القاتل"

یعنی اگر اسلام پیش کرنے سے پہلے ہی کوئی اسے قتل کردے تو یہ فعل مکروہ ہے لیکن قاتل سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ {شرح فتح القدیر۔ ابن الہمام: ۳۸۶،۳۸۹، ج/۵}

سامنے ہی بنایا گیا ہے کہ:۔

"مکروہ ہونے کے معنے یہاں پر یہ ہیں کہ مستحب طریقہ کے خلاف عمل کیا گیا اور بازپرس نہ ہونا اس لیے ہے کہ اس کے کفر کے باعث قتل مباح ہو چکا تھا اور اگر دعوت اسلام اسے پہنچ چکی ہے تو پھر اسلام پیش کرنا بھی واجب نہیں ہے۔" (حوالۂ مذکورہ)

ظاہر ہے کہ جو شخص اس شد و مد سے قتل مرتد کا حامی ہو وہ اس سزا کو غیر منصفانہ کیسے کہہ سکتا ہے۔ علامہ چلپی اس باب میں اس سے بھی زیادہ متشدد معلوم ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ:۔

"مرتد کو اسلام لانے کے لیے کہا جائے اور انکار کرے تو وہیں قتل کر دیا جائے تین دن کی مہلت نہ تو واجب ہے اور نہ ہی مستحب"

غرض علماء میں سے ایک فرد بھی میرے علم میں ایسا نہیں ہے جس نے اسلامی حکومت میں مرتد کی سزا قتل نہ قرار دی ہو۔

دراصل مولف کتاب کی یہ پانچویں کذب بیانی ہے۔ پھر اس کی تائید میں جو کچھ انہوں نے ارشاد فرمایا وہ سلسلہ اکاذیب بن گیا چنانچہ ارشاد ہے کہ اکثریت کی اس رائے کی تائید (یعنی مرتد کی کوئی سزا اس دنیا میں نہیں ہے) مختلف طریقوں سے بعض متقدمین نے بھی کی ہے۔

اس جملہ میں دو باتیں غلط ہیں کہ نہ یہ اکثریت کی رائے ہے اور نہ متقدمین میں سے کسی نے اس کی تائید کی ہے۔ پھر فرمایا (تضاد ملاحظہ ہو) کہ اکثریت کی اس رائے کے خلاف (کہ مرتد کو یا تو مہلت مطلق نہ دی جائے یا بہت مختصر سی مدت توبہ کے لیے دی جائے) ابراہیم نخعی اور سفیان ثوری کا یہ خیال ہے کہ مرتد کے لیے توبہ کا دروازہ تاعمر کھلا ہوا ہے اس کا مطلب جیسا کہ ابن قدامہ نے بتایا یہ ہے کہ مرتد کو کبھی قتل نہ کیا جائے گا۔ یہ ساری عبارت [illegible] ہے۔ نہ ابراہیم نخعیؒ اور سفیان ثوریؒ نے یہ کہا ہے کہ تمام عمر اس کی توبہ کا انتظار

کیا جائے اور نہ ابن قدامہ نے یہ سمجھا ہے کہ مرتد کو کبھی قتل نہ کیا جائے۔ ابراہیم نخعی اور سفیان ثوری کا جو خیال ہے وہ ابن قدامہ کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

"أنه لا یقتل حتی یستتاب ثلاثا هذا قول اکثر اهل العلم منهم عمر و علی و عطاء والنخعی و مالک والثوری والاوزاعی و اسحاق و اصحاب الرأی و هو احد قولی الشافعی"

یعنی مرتد کو قتل نہ کیا جائے جب تک کہ تین بار اسے توبہ کے لیے نہ کہہ لیا جائے۔ بیشتر اہل علم کا یہی قول ہے جن میں حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما اور عطاء اور نخعی اور مالک اور ثوری اور اوزاعی اور اسحٰق اور جملہ اصحاب رائے (یعنی فقہاء) شامل ہیں۔ امام شافعی کے بھی دو اقوال میں سے ایک یہ ہے۔ (المغنی ص۷۴)

دوسرا قول ان کا یہ ہے کہ مرتد توبہ کر لے تو بہتر ورنہ فوراً قتل کر دیا جائے یعنی مہلت نہ دی جائے۔ (ایضاً ص۷۴)

معلوم ہوا کہ ابراہیم نخعی اور سفیان ثوری نے ہرگز یہ نہیں کہا کہ تمام عمر مرتد کو توبہ کے انتظار میں چھوڑ دیا جائے بلکہ صرف تین دن کی مہلت دی جائے گی اور وہ بھی قید میں رکھ کر۔ اس باب میں تحقیق یہ ہے کہ ثوری نے صرف یہ کہا ہے کہ اس کی توبہ ہمیشہ قبول کی جائے گی خواہ کتنی ہی بار وہ توبہ توڑ چکا ہو۔ یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ توبہ کے انتظار میں اسے آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔ ان کا اصل مقصد وہی ہے کہ تین دن توبہ کی تلقین کے بعد اگر نہ مانے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ لیکن ابن قدامہ کو نخعی کے اس خیال سے بھی اختلاف ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں

"وقال النخعی یستتاب ابدا وهذا یفضی الی ان لا یقتل ابدا و هو مخالف للسنة والاجماع" (المغنی ص۷۴)

نخعی کہتے ہیں کہ ہمیشہ اس کی توبہ کو مانا جائے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ

وہ کبھی قتل نہ کیا جا سکے گا اور ایسا کرنا سنت اور اجماع کے خلاف ہے۔

پس ابن قدامہ کے نزدیک مرتد کی توبہ کو ہمیشہ کے لیے مانتے چلے جانا بھی خلاف اسلام ہے۔ مؤلف کتاب نے ابن قدامہ کے الفاظ وھو مخالف للسنۃ والاجماع کا ترجمہ نہیں کیا۔ قابلِ ملاحظہ امر یہ ہے کہ جس امر کو ابن قدامہ خلافِ سنت و اجماع کہتے ہیں بکمالِ کرم مؤلفِ کتاب نے اسی کے متعلق یہ تاثر دینے کی کوشش فرمائی ہے کہ گویا ابنِ قدامہ اس امر کے قائل ہیں ص۱۳۴! قطع نظر اس کے ابن قدامہ یہ بھی تو کہتے ہیں کہ:۔

ینبغی ان یضیق علیہ فی المدۃ الاستتابۃ ویحبس لقول عمر ھلا حبستموہ ....

یعنی مدتِ استتابہ کے دوران مرتد پر سختی کی جائے اور اسے قید میں رکھا جائے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ تم نے معربہ (مرتد) کو قتل کرنے سے پہلے تین دن قید میں کیوں نہ رکھا اسے ہر روز روٹی کا ایک ٹکڑا دے دیتے اور توبہ کو کہتے شاید توبہ کر کے اللہ کی جانب رجوع کر لیتا۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا فاضل مؤلف ابن قدامہ کے اس فیصلہ کو تسلیم فرمانے پر تیار ہیں؟ اگر وہ اس کو نہیں مانتے تو آخر انہیں کیا مجبوری ہے کہ جس بات کو خود ابن قدامہ خلاف خدا اور رسول فرما رہے ہیں اس کی نہ صرف یہ کہ تائید کریں بلکہ الٹا ابن قدامہ کے سر تھوپنے کی زحمت بھی گوارا فرمائیں۔

مؤلف کتاب کی نئی تجویز

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جناب مؤلف کو خود بھی ایک مسلمان کا دین سے پھر جانا کوئی پسندیدہ فعل نہیں معلوم ہوتا۔ چنانچہ ان کی تجویز یہ ہے کہ مرتد کی سزا کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس کی تعزیر کی جائے۔ قرآنی حد کی طرح نہیں بلکہ اس طرح جیسے کہ شراب پینے کی سزا دی جاتی ہے ص۱۳۵! وہ شربِ خمر کی سزا کو جسے حدود میں شمار کیا جاتا ہے حد خیال

نہیں فرماتے بلکہ اس کو تعزیر کہنا پسند فرماتے ہیں۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ مرتد کی کیا سزا ہونی چاہیئے تاہم یہ فرمایا ہے کہ جرم کی نوعیت کے اعتبار سے مناسب سزا ہونی چاہیئے۔ اور مناسب ان کے نزدیک یہ ہے کہ اس کی سزا آخرت پر چھوڑ دینی چاہیئے کیونکہ یہ جرم حقوق اللہ کے زمرہ میں آتا ہے حقوق العباد کے زمرہ میں نہیں آتا ...... صفحہ ۱۳۵

یہ تو مؤلف کتاب کو اختیار ہے کہ وہ جو چاہیں ارشاد فرمائیں۔ ہر شخص کو آزادیٔ تقریر حاصل ہے لیکن ان کی عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس خیال کو بھی علامہ سرخسی کے سر تھوپنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ حالانکہ سرخسی نے کہیں یہ نہیں لکھا۔ البتہ انہوں نے بعض غیر حنفی مسالک کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ اصحاب مرتد عورت کو بھی مستوجب قتل قرار دیتے ہیں۔ علامہ سرخسی انہیں کے دلائل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مرتد عورت کا قتل دوسری باتوں کے علاوہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ:۔

کان قتل المرتد من خالص حق اللہ تعالٰی وما یکون من خالص حق اللہ فهو جزاء وفی اجزیۃ الجرائم الرجال والنساء سواء کحد الزنا والسرقۃ وشرب الخمر (ج ۱۰ صفحہ ۱۰۹)

یعنی دین حق سے پھر جانے والے کو قتل کرنا حقوق اللہ میں سے ہے اور جو خالص اللہ کا حق ہے وہ سزا ہے اور جرائم کی سزا میں مرد اور عورت سب برابر ہیں جیسے زنا، چوری اور شراب نوشی کی سزائیں۔

اس قول میں مرتد کی سزا کو حق اللہ قرار دیا گیا ہے۔ جناب مؤلف اس عبارت کو نہ سمجھ سکے اور اس کا ترجمہ یہ کیا کہ:۔

Apostasy being an offence in the realm of the rights of God i.e. Huquq Allah as Sarkhasi has pointed out.

ان اصحاب کے قول کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص قتل مرتد کو حق اللہ کی

ادائیگی تصور نہ کرے وہ گویا حق اللہ سے منکر ہے۔

اب خیال فرمایئے کہ اس مدعا کو جناب مولف نے محض عبارت نہ سمجھنے کے باعث کیسی ٹھوکر کھائی کہ اس کے بالکل برعکس یہ نتیجہ نکالا کہ مرتد کو سزا دینی ہی نہ چاہیئے بلکہ اسے آخرت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔

غرض اس کتاب میں اس قسم کے بے تعلق خیالات کی اتنی بھرمار ہے کہ ہر ایک کی تفصیل نہیں بیان کی جاسکتی۔ صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ جناب مؤلف جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یکسر اس نتیجہ کے خلاف ہے جس پر علماء، فقہاء، مجتہدین، مفسرین، محدثین بلکہ خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پہنچے۔

اقوام متحدہ اور قتل مرتد

اب اخیر میں مؤلفِ کتاب نے اقوام متحدہ کے میثاق کا سہارا پکڑا ہے اور قتلِ مرتد کے حکم کو اس کے خلاف بتایا ہے لیکن مقامِ حیرت ہے کہ تمام میثاق میں کہیں بھی اس حکم کے خلاف ایک حرف بھی نہیں ہے۔ انہوں نے میثاق میں جس بنیادی مضمون کا ذکر فرمایا ہے اس کی دفعہ نمبر ا میں اقوامِ متحدہ کا مقصد بتایا گیا ہے کہ وہ بین الاقوامی اقتصادی و عمرانی و ثقافتی و انسانی مسائل کو باہمی تعاون سے حل کرے گی لیکن کیا جناب محترم مؤلفِ کتاب بتا سکتے ہیں کہ پاکستان اور عربوں کے مسائل حل کرنے میں اس نے کہاں تک اپنے فرائض کو انجام دیا تحفظِ انسانیت کے لیے پھر دفعہ ۵۵ میں بتایا گیا ہے کہ تمام اقوام انسان کے انسانی حقوق اور بنیادی آزادی کا احترام برقرار رکھیں گی۔ اس میں قوم، جنس، زبان اور مذہب میں کوئی امتیاز روا نہ رکھا جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ کیا اردو زبان کو قومی زبان اور مملکت کا مذہب اسلام قرار دینا امتیازی سلوک نہیں ہے تو سب سے پہلے اس پر آواز اٹھائی جائے یا پھر یہ کہ جناب مؤلف نے اس قانون کی روح سمجھنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ قانون کا مدعا صرف یہ ہے کہ مملکت کا

مذہب اسلام اور قومی زبان کا اردو ہونا غیر مذاہب کے عقائد اور ثقافت پر مخل انداز نہ ہوگا۔

جنرل اسمبلی اور مسئلہ ارتداد

پھر ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کی جنرل اسمبلی میں انسانی حقوق کے متعلق ایک اعلان کا ذکر فرمایا ہے جس کی دفعہ ۱۰ میں یہ کہا گیا ہے کہ ہر شخص کو اپنا مذہب انفرادی یا اجتماعی طور پر بدلنے کا حق ہے اور قتل مرتد کی سزا اس کے خلاف ہے۔

بہتر ہوتا کہ فاضل مؤلف اس کتاب کی تالیف میں وقت ضائع کرنے کی بجائے جنرل اسمبلی کے دوسرے اعلانات کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اقوام عالم سے ان پر عمل پیرا ہونے کی درخواست کرتے۔ اس اعلان میں غیر مسلم اقوام کی اکثریت نے محض ذاتی مصلحتوں کو پیش نظر رکھا ہے اور جس پر وہ کامیابی کے ساتھ عمل پیرا ہیں وہ فاضل مؤلف کی نگاہوں سے مخفی نہیں ہے۔ کاش! انہیں احساس ہو کہ اعلان کی یہ دفعہ درپردہ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے ایمانی حصار پر فیصلہ کن ضرب کی مترادف ہے ورنہ اگر مسلم قوم اپنے ہی کسی ایک فرد کو جرم ارتداد میں پھانسی دے دیتی ہے تو ان کا کیا بگڑتا ہے۔

بایں ہمہ جناب مؤلف نے خود فرمایا ہے کہ یہ اعلان کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتا، جس کی پابندی لازمی ہو لیکن اقوام متحدہ کے ارکان پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ اس کو نظر انداز نہ کریں۔

ملت اسلامیہ کی روح کو ان کے اس ارشاد سے اتنا صدمہ نہیں پہنچا جتنا کہ ان کے اس خیال سے پہنچا ہے کہ اقوام متحدہ کا یہ فیصلہ اس روح تحمل و رواداری کے منافی نہیں ہے جو قرآن اور سنت نے پیش فرمایا ہے لہذا اس پر عمل پیرا نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

میں نہایت ادب سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کے رگ و ریشہ میں تحمل اور رواداری کی جو روح پیوست ہے وہ اقوام متحدہ کے اس مکارانہ فیصلہ سے کہیں زیادہ ہے۔

غیر مسلم اقوام کی اکثریت مذہب اسلام کے ترک پر سزا دینے سے اس لیے مانع نہیں

ہے کہ یہ حکم آزادیٔ ضمیر یا انسانی حقوق کو پامال ہونے سے بچانا چاہتی ہے بلکہ وہ محاذِ طاقت کے علاوہ دوسرے محاذ سے بھی ملّتِ اسلامیہ پر حملہ آور ہونے کا عزم کیے ہوئے ہے تاکہ اس کے وہ عزائم پورے ہو سکیں جن میں محض اس حکم کے باعث عیسائی مشنری زویمر یا ڈاکٹر ہنڈریو واٹسن ناکام رہے اور جن کا ذکر کتاب کے آغاز میں آچکا ہے۔

چوہدری محمد علی کی وصیت

بالآخر مؤلف کتاب نے چوہدری محمد علی سابق وزیر اعظم پاکستان کی انگریزی کتاب Emergence of Pakistan کے حوالہ سے بتایا ہے کہ دونوں ملکوں کی سے اقلیت کو یکساں حقوق اور تحفظ حاصل ہوگا .... وغیرہ۔ تاہم اس حقیقت کی نفی نہیں ہو سکتی کہ پاکستان مسلم اکثریت کا ملک ہے اور اس لیے مسلم قوم سے اس کی ملکی سربراہی کی ذمہ داریوں کو چھینا نہیں جا سکتا اور یہ ملکی حکومت لامحالہ اسلام کی بنیاد پر قائم ہوگی ......

یہ نیاز مند یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس تمام بیان کو ارتداد کے جرم سے جو اکثریت کے لیے مخصوص ہے، اقلیت کے حقوق سے کیا نسبت ہے۔ کوئی قانون جو اکثریت کے حق میں کتنا ہی سخت ہو اقلیت پر کس طرح اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اور مؤلف کتاب کس بنا پر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگر کوئی ایسی تجویز پیش کی گئی کہ اسلامی قانون کی رو سے جو مسلمان اپنے مذہب سے برگشتہ ہو جائے وہ قانون کی رو سے مستوجب سزا ہو تو ہمارے ملکی قانون سازی کی راہ میں رکاوٹ ہوگی۔ اس کے بعد یہ فقرہ نہایت دلچسپ ہے کہ افسران مجاز اس قانون کی رو سے ایسے شخص کو مستوجب سزا قرار دینے میں اپنے اختیارات کو کام میں لانے سے عاجز ہوں گے اور مذہبِ اسلام سے پھر جانے والے کو معمولی سزا بھی نہ دے سکیں گے ص۱۳۸

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کو اس امر پر بھی افسوس ہے کہ اسلام سے برگشتہ ہونے والا (یا مرتد) ایک قلم بے قصور تصور کیا جائے اور دنیا میں کوئی سزا نہ پا سکے۔ حالانکہ تمام کتاب کا مقصد صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ مرتد بے قصور ہے۔

سزائے قتلِ مرتد بھی باعثِ رحمت ہے

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں اسلام سے برگشتہ ہونے والے کی یہ سزا نہ اقلیت پر اثرانداز ہے نہ پاکستان کے بنیادی اصول کے خلاف ہے نہ قانون سازی میں کسی قسم کی مزاحمت ہو سکتی ہے اور نہ افسرانِ مجاز کو قانون کے مطابق سزا دینے میں کوئی رکاوٹ پیش آسکتی ہے کیونکہ اسلام میں بعض جرائم کی اس سے بھی سخت سزا مقرر ہے مثلاً سنگساری، پھانسی، قصاصِ جراحت، دُرّہ زنی اور دست و پا کا مخالف سمتوں سے کاٹا جانا وغیرہ۔

تاریخِ عالم میں جن اسلامی ملکوں میں ان سزاؤں کا نفاذ تھا یا ان میں سے جن سزاؤں کا اب بھی نفاذ ہے وہاں کے معاشرے میں ان جرائم کا نام و نشان بھی نہیں ہے اور گویا یہ سزا بندگانِ خدا اور ملکی امن و امان کے لیے اسی طرح باعثِ رحمت ہے جس طرح قصاص کہ ولکم فی القصاص حیوۃ (یعنی حکمِ قصاص جزائے قتل میں اہلِ عالم کی زندگی کا راز ہے)

اس قانونِ قتلِ مرتد کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو شخص اسلام لائے گا وہ مسلمان ہونے سے پہلے یہ سوچ لے گا کہ جس مذہب کا اس نے دامن پکڑا ہے وہ عمر بھر کے لیے اس کے لیے موجبِ رحمت و برکت ہے اور اس رحمت سے منہ موڑنا دنیا میں بھی ناکامی کا موجب ہے اور آخرت میں بھی۔ اس تصور کے ساتھ مسلمان ہونے والا مال و زر یا خواہشاتِ نفسانی کی لعنت سے پاک اور خالص خدا پرست ہوگا۔ اگر اس میں ڈھیل دی گئی تو اسلام لانا ایک مذاق بن کر رہ جائے گا۔ اور اسلامی معاشرے کا ایک فرد بھی شکوک و شبہات کی آماجگاہ سے نہ بچ سکے گا۔ ایک شخص آج مسلمان ہے کل ہندو پرسوں عیسائی اور اس کے بعد یہودی۔ ایسے اشخاص کی معاشرہ میں موجودگی بجائے خود فتنہ و فساد کا فتح الباب ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس قانون میں دوسرے تعزیری قوانین سے زیادہ امن و عافیت کے مقصد کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ باوجود اس کے وہ مذہب اسلام سے برگشتہ ہو جانے کو جرم قابلِ تعزیر نہیں سمجھتے اور انتہائی افسوسناک امر یہ ہے کہ وہ اپنے اس قطعاً غیر اسلامی نظریہ کو سنتِ رسول اللہ ﷺ

کے مطابق فرماتے ہیں۔

کذب پر خاتمہ

چنانچہ ان کی کتاب کا آخری فقرہ بھی اس کذب بیانی پر ختم ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم الشان سنت کسی طرح بھی اس کے خلاف نہیں ہے (کہ اسلام سے پھر جانے والے کو اس دنیا میں کوئی سزا نہ دی جائے) انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ضمیمۂ نافعہ

ارتداد اسلام کا سب سے بڑا جرم ہے

واضح ہو کر صفحاتِ ماسبق میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ مرتد کی کوئی سزا اسلام میں نہیں ہے اور یہ عرض کیا گیا ہے کہ یہ خیال سراسر قرآن وحدیث، آثار صحابہ، مفسرین و محدثین و فقہائے امت بلکہ تمام ملتِ اسلامیہ کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس یہ امر مسلّمہ ہے کہ ارتداد اسلام کا سب سے بڑا جرم ہے اور اس کی سزا قتل ہے جس پر امتِ مسلمہ کا اجماع ہے۔ عہدِ نبوی سے لے کر اب تک تاریخِ اسلام کے اوراق میں کوئی ایک نظیر بھی ایسی نہیں ہے کہ اسلامی حکومت یا جہاں کہیں احکامِ اسلامی کا نفاذ ہے کبھی کسی جرم ارتداد کے مجرم کو زندہ رہنے کا حق دیا گیا ہو تا آنکہ اس نے توبہ نہ کی ہو اور دوبارہ اسلام نہ لایا ہو۔

ملتِ اسلامیہ اس خیال کو بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ قتل ارتداد کے واضح اور قطعی حکم کے خلاف کوئی مسلمان آواز بلند کرے اس جرم کی حمایت بالکل ایسی ہے جیسے فوج سے باغی سپاہی یا قتل کے مجرم کو کوئی شخص پناہ دے۔

اسلام کا پہلا مرتد

اسلام کا سب سے بڑا فتنہ جس کا آغاز نبوت کے جھوٹے دعوے سے ہوا۔ اس کی ابتداء عیہلہ بن کعب نے کی جو اسود عنسی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ شخص اہل یمن کے ساتھ مسلمان ہوا لیکن پھر دعوئے نبوت کر بیٹھا۔ اسلام کا سب سے پہلا مرتد یہی شخص ہے۔

(الزرکلی الاعلام جلد ۵ صفحہ ۲۹۹)

اس شخص کو شیطان کی اعانت حاصل تھی۔ اس نے صرف چار ماہ کے قلیل عرصہ میں

اسلام کے خلاف ایک لشکر تیار کر لیا۔ اس کی فوج سات سو اسپ سواروں پر مشتمل تھی حضر موت سے لے کر طائف، بحرین، احساء اور عدن کا علاقہ اس کے زیر اثر آچکا تھا بخران اور صنعاء کے قبائل اس کے پیرو ہو گئے تھے لیکن یمن کے بچے کھچے مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تحریری فرمان کے مطابق جس میں اسود عنسی کو اس جرم ارتداد کی پاداش میں قتل کا حکم تھا، ۱۱ھ میں موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس کا نام ونشان مٹ گیا، اس نے اپنا لقب رحمٰن رکھا اور رحمٰن یمن کے نام سے مشہور تھا۔

مسیلمہ کذاب

اسی قسم کی ایک تحریک نجد کے علاقہ وادیٔ حنفیہ سے اٹھی جس کا بانی مسیلمہ ابن ثمامہ یا ہارون تھا۔ اس نے بھی اپنا لقب، رحمان رکھا اور رحمٰن یمامہ کے نام سے مشہور ہوا نبوت کا دعوٰے کرنے کے باعث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مکتوب میں اسے مسیلمہ کذاب کے لقب سے یاد فرمایا اور یہ لفظ اس کے نام سے کچھ اس طرح مربوط ہے کہ اہل عرب سب سے زیادہ جھوٹے کو اب بھی محاورہ میں اکذب من مسیلمہ کہتے ہیں (یعنی مسیلمہ سے زیادہ جھوٹا)

مسیلمہ کذاب کا دعوٰے تھا کہ ایتہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں رحمٰن اس کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی اس وحی میں اس کی تصدیق فرمائی ہے یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر فتح ممالک کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اسی غرض سے اس نے اپنے دو قاصد بارگاہِ نبوت میں بھیجے جس میں سے ایک مسلمان ہو گیا اور دوسرے کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر یہ قاصد کی حیثیت میں نہ آیا ہوتا تو میں اسے قتل کر دیتا جس سے عیاں ہے کہ نہ صرف مدعی نبوت بلکہ وہ بھی جو حضور کے بعد کسی مدعی نبوت کا پیرو ہے، مستوجب سزا ہے۔ چنانچہ یہ دوسرا قاصد بھی جب عہد خلافت اولیٰ میں دوبارہ آیا تو قتل کرا دیا گیا کیوں کہ اب کی بار وہ قاصد کی حیثیت

میں نہیں آیا تھا۔ حضور کی زندگی میں اس شخص کی بیخ کنی نہ ہو سکی لیکن حضور کی وصایائے مرضِ وفات میں سے ایک وصیت اس مرتد کا خاتمہ بھی تھی اس لیے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جیوشِ اسلامیہ کے سب سے بڑے سپہ سالار حضرت خالد ابن الولید کی سرکردگی میں ایک لشکر مسیلمہ کی سرکوبی کے لیے ارسال فرمایا جس نے بنی حنیفہ کا محاصرہ کیا۔ مسیلمہ کے معتقدین کی طاقت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ طرفین میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ مسلمانوں کی تعداد اس وقت تک بہت تھوڑی تھی تاہم بارہ سو افراد نے جامِ شہادت نوش کیا جس میں چون صحابی اور لاتعداد حفاظِ قرآن تھے۔

لیکن انجام کار مسلمانوں کو فتح و نصرت حاصل ہوئی اور مسیلمہ کذاب اور اس کی تمام جماعت مسلمانوں کی خون آشام تلواروں کا لقمہ بن گئی۔ اس وقت سے لے کر آج تک کسی اسلامی مملکت میں کسی فردِ مسلم کو اسلام سے پھر کر کوئی اور مذہب اختیار کرنے کی کبھی اجازت نہیں دی گئی۔

جھوٹے مدعیانِ نبوت

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹے مدعیانِ نبوت کی خبر پہلے سے دے دی ہے ان کی تعداد تیس کے قریب بیان فرمائی ہے۔ بظاہر یہ قابلِ ذکر مدعیانِ نبوت کی تعداد ہے ورنہ چھوٹے موٹے نبوت کے خبطیوں کی تعداد بہت ہے۔ ان میں سے نہ معلوم کتنے مدعیانِ نبوت آئے اور لقمۂ اجل ہوئے اور نہ معلوم ہنوز کتنے باقی ہیں۔

عہدِ حاضر کا ایک قابلِ ذکر مدعیٔ نبوت

عہدِ حاضر میں جس قابلِ ذکر مدعیٔ نبوت کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے وہ ایران کے مردم خیز شہر شیراز کا علی محمد ابن مرزا رضی البزاز تھا جو ۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۲۶۶ھ / ۱۸۵۰ء میں قتل کر دیا گیا اور اس کی لاش ایک خندق میں پھینک دی گئی۔ بعد میں اس کے کچھ مریدوں نے اس کا ڈھانچہ اٹھایا اور کہا جاتا ہے کہ اب فلسطین میں

اس کی ایک قبر بنادی گئی ہے لیکن حکومتِ ایران نے بانی مذہب کے پیرؤوں کو ملک سے باہر نکل جانے کا حکم دے دیا تھا۔ اب معلوم نہیں صورت حال کیا ہے۔

تاریخ ارتداد و مرتدینِ اسلام میں مدعیان نبوت اوران کے پیرؤوں کا کردار ملتِ اسلامیہ کے لیے ہمیشہ سخت نقصان دِہ رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی ارتداد یا دینِ اسلام سے منحرف ہونے کا چوپٹ دروازہ ان ہی مدعیانِ نبوت نے کھولا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی ابتدا حمایتِ دینِ اسلام سے ہوتی رہی اور مسلمانوں کا سوادِ اعظم ان کا حامی رہا۔ پھر آہستہ آہستہ انہوں نے اپنے مقاصدِ مشئومہ میں خاصی کامیابی حاصل کی۔

مرزا غلام احمد قادیانی

مرزا غلام احمد قادیانی کا کردار اس کی واضح ترین مثال ہے۔ ان کی تالیفات نثر و نظم ان کی اپنی شان میں ایک مسلسل قصیدہ ہے جس میں تمہید، تشبیب، گریز، مقصد، [illegible] کے پنجگانہ عناصر نہایت ہوشیاری اور چابک دستی سے ترتیب دیے گئے ہیں۔

ختم نبوت کا اعتراف

تمہید کے لیے تو صرف یہ بیان ملاحظہ کیجیے:۔

"جو شخص نبوت کا دعوٰے کرے گا۔ اس دعوے میں ضرور ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کرے اور نیز یہ بھی کہے کہ خدا [illegible] میرے پر وحی نازل ہوتی ہے۔ نیز خلق اللہ کو وہ کلام سنائے جو اس پر خدا تعالےٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور ایک امت بنائے جو اس کو نبی سمجھتی ہو اور اس کی کتاب کو کتاب اللہ جانتی ہو" (آئینہ کمالاتِ اسلام ص ۳۴۴)

چنانچہ آئندہ آپ کو معلوم ہو گا کہ انہوں نے کس صفائی سے کہا کہ میرے پر وحی نازل ہوتی ہے اور کس طرح وہ کلام خلق اللہ کو سنایا اور کیونکر ایک امت کی بنیاد ڈالی اور کس طرح اس امت نے ان کی کتاب کو کتاب اللہ جانا۔ اور اب اس تمہید کی تشبیب ملاحظہ ہو۔

"میں ایمان لاتا ہوں اس پر کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ نبیوں کو ختم کر دیا۔"

"........ آپ کی وفات کے بعد وحی منقطع ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر نبیوں کا خاتمہ فرما دیا۔"

"میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ختم المرسلین کے بعد کسی دوسرے مدعی نبوت و رسالت کو کاذب و کافر جانتا ہوں۔"

مدعی نبوت پر لعنت

"مجھے کب جائز ہے کہ میں نبوت کا دعوے کر کے اسلام سے خارج ہو جاؤں اور کافروں کی جماعت سے جا ملوں (ترجمہ) ہم مدعی نبوت پر لعنت بھیجتے ہیں۔"

"کیا ایسا بدبخت مفتری جو خود رسالت و نبوت کا دعوے کرتا ہے قرآن شریف پر ایمان رکھ سکتا ہے؟"

"کس قدر جرأت اور دلیری اور گستاخی ہے کہ خیالات رکیکہ کی پیروی کر کے نصوص صریحہ قرآن کو عمداً چھوڑ دیا جاتے اور خاتم النبیین کے بعد ایک نبی کا آنا مان لیا جائے۔"

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار فرمایا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ قرآن شریف اپنی آیت وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ سے بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ فی الحقیقت ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہو چکی ہے۔"

"ظاہر ہے کہ اگرچہ ایک ہی دفعہ وحی کا نزول فرض کیا جائے اور صرف ایک ہی فقرہ حضرت جبریل لائیں اور پھر چپ ہو جائیں۔ یہ امر بھی ختم نبوت

کے منافی ہے ...."

یہ بات مستلزم محال ہے کہ خاتم النبیین کے بعد پھر جبریل علیہ السلام کی وحی رسالت کے ساتھ زمین پر آمد و رفت شروع ہو جائے۔"

اب کون ہے جو ایسے راسخ العقیدہ مسلمان کے ان ایمان افروز اقوال کی صداقت پر ایمان نہ لاتا۔ بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ اسلام کی سربلندی کے بلند بانگ دعووں کے ساتھ مخالفینِ اسلام کے مقابلہ میں حمایتِ دین کا پرچم بھی اس کے ہاتھ میں ہو۔ بدقسمتی سے ناعاقبت اندیش مسلمانوں خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ اور فیاض طبع اشخاص کی عقیدت و حمایت مرزا غلام احمد صاحب کی حوصلہ افزائی کا سبب ہوئی اور ان الفاظ کا وہ پردہ جو ان کے ادعائے نبوت پر پڑا ہوا تھا، اب انھوں نے خود ہی آہستہ آہستہ ہٹانا شروع کر دیا جو اس تشبیب کے بعد بطور گریز کے ہے۔

مجازی نبی

ابھی تک دعوئے نبوت کا کلیتہً انکار تھا لیکن اب مجازی معنوں میں نبوت اور حقیقی معنوں میں محدث ہونے کا اعتراف ملاحظہ ہو:۔

"یہ سچ ہے کہ وہ الہام جو خدا نے اس بندہ پر نازل فرمایا اس میں اس بندے کی نسبت نبی اور رسول کے الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ سو یہ حقیقی معنوں پر محمول نہیں ہے ...... مجازی معنوں کی رو سے خدا کو اختیار ہے کہ کسی ملہم کو نبی کے لفظ سے یا رسول کے لفظ سے یاد کرے۔"

"اس عاجز کی اس بات کو یاد رکھیں کہ ہم لوگ معجزہ کا لفظ اس محل پر بولتے ہیں جو کوئی خوارق عادت کسی نبی یا رسول کی طرف منسوب ہو لیکن یہ عاجز نہ نبی ہے اور نہ رسول ہے۔ سو اس جگہ کرامت کا لفظ موزوں ہے نہ کہ معجزے کا۔"

"اس عاجز نے کبھی اور کسی وقت حقیقی طور پر نبوت یا رسالت کا دعوے نہیں کیا۔ غیر حقیقی طور پر کسی لفظ کو استعمال کرنا اور لغت کے عام معنوں کے لحاظ سے اس کو بول چال میں لانا مستلزم کفر نہیں ہے مگر میں اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ اس میں عام مسلمانوں کو دھوکا لگ جانے کا احتمال ہے"

مسلمان بھائیوں کی دل جوئی

"جس صورت میں ابتدا سے میری نیت میں جس کو اللہ جل شانہ خوب جانتا ہے۔ اس لفظ نبی سے مراد نبوت حقیقی نہیں بلکہ صرف محدث مراد ہے جس کے معنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متکلم مراد لیے ہیں...... تو پھر مجھے اپنے مسلمان بھائیوں کی دل جوئی کے لیے اس لفظ کو دوسرے پیرائے میں بیان کرنے سے کیا عذر ہو سکتا ہے سو دوسرا پیرایہ یہ ہے کہ بجائے لفظ نبی کے محدث کا لفظ ہر ایک جگہ سمجھ لیں اور اس کو یعنے نبی کو مجازاً ہی خیال فرمائیں"

یہاں پر مسلمانوں بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ نے پھر ٹھوکر کھائی اور مرزا صاحب کے متعلق حسن ظن سے کام لیتے رہے لیکن مرزا صاحب نے اس حال میں رہنا گوارا نہ کیا۔ چنانچہ اب انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اپنے دعوے کے چہرہ نازیبا سے نقاب ہٹانا شروع کر دیا۔

اس امت کا محدث

"یہ عاجز خدا تعالیٰ کی طرف سے اس امت کے لیے محدث ہو کر آیا ہے اور محدث بھی ایک معنے سے نبی ہوتا ہے .... اور بعینہٖ انبیاء کی طرح مامور ہو کر آتا ہے اور انبیاء کی طرح اس پر فرض ہوتا ہے کہ اپنے تئیں باواز بلند ظاہر کرے اور اس سے انکار کرنے والا ایک

حد تک مستوجب سزا ہوتا ہے اور نبوت کے معنے بجز اس کے کچھ نہیں کہ امور متذکرہ بالا اس میں پائے جائیں"

اس کے بعد محدث اور نبی کے ہم معنے ہونے کی دلیل بھی سینئے :۔

" اگر خدا سے غیب کی خبریں پانے والا نبی کا نام نہیں رکھتا تو پھر بتاؤ اس کو کس نام سے پکارا جائے ۔ اگر اس کا نام محدث رکھا جائے تو میں کہتا ہوں محدث کے معنے کسی لغت کی کتاب میں اظہار غیب کے نہیں ہیں مگر نبوت کے معنے اظہار غیب ہے"

مرزا صاحب نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ ان تکلفات سے کام نہ چلے گا کیوں نہ صاف صاف اپنا ارادہ ظاہر کر دیا جائے ۔ چنانچہ ارشاد ہے :۔

نبی کا خطاب

" اوائل میں میرا عقیدہ تھا کہ مجھ کو مسیح سے کیا نسبت ہے وہ نبی ہے اور خدا کے بزرگ مقربین میں سے ہے اور اگر کوئی امر میری فضیلت کی نسبت ظاہر ہوتا ہے تو میں اس کو جزوی فضیلت قرار دیتا تھا مگر بعد میں خدا کی وحی میرے پر نازل ہوئی اس نے مجھے اس عقیدہ پر قائم نہ رہنے دیا اور صریح طور پر نبی کا خطاب مجھے دیا گیا ۔

مجھے اپنی وحی پر ایسا ہی ایمان ہے جیسا کہ توریت اور انجیل اور قرآن پر ۔

خدا تعالیٰ نے اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کہ میں اس کی طرف سے ہوں اس قدر نشان دکھائے ہیں کہ وہ ہزار نبی پر بھی تقسیم کیے جائیں تو ان سے بھی ان کی نبوت ثابت ہو سکتی ہے .... پھر بھی جو لوگ انسانوں میں سے شیطان ہیں سو نہیں مانتے"

مقامِ غور ہے یہی وہ شیطان ہیں جن کی تشفی کے لیے انہوں نے اپنی تحریروں میں بجائے نبی کے محدث کا لفظ سمجھ لینے کا حکم دیا تھا لیکن اب وہی فرماتے ہیں کہ :

"میں کوئی نیا نبی نہیں مجھ سے پہلے سینکڑوں نبی آچکے ہیں ......

جن دلائل سے کوئی سچا نبی مانا جاسکتا ہے ۔ وہ دلائل میرے صادق ہونے کے ہیں میں بھی منہاج نبوت پر آیا ہوں "

ترکِ عقیدہ کی تاریخ

غلام احمد قادیانی صاحب کے اس ترکِ عقیدہ کی تاریخ یوں بیان کی گئی ہے کہ :

"جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور وفات کے بارے میں آپ کے عقیدہ میں تبدیلی ہوئی یعنی پہلے آپ ایک زمانہ تک حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو زندہ سمجھتے رہے اور پھر ان کے فوت شدہ ہونے کا اعلان کیا ۔ اسی طرح نبوت کے بارے میں بھی حضور کے خیالات میں تغیر ہوا یعنی ایک زمانہ تک آپ اپنے آپ کو نبی نہیں خیال فرماتے تھے لیکن پھر اپنے آپ کو نبی یقین کرنے لگے .... مسئلہ نبوت میں آپ نے عقیدہ ۱۹۰۱ء کے قریب تبدیل کیا " (الفضل ۱۳ جون ۱۹۴۰ء)

اور یہ عقیدہ کب تک قائم رہا ـــــ ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مرتے دم تک وہ اس عقیدہ پر قائم رہے اور توبہ کی توفیق نہیں ہوئی ۔ انہوں نے ایک خط میں لکھا کہ :

"میں خدا کے حکم سے نبی ہوں اگر میں اس سے انکار کروں تو میرا گناہ ہوگا .... "

"یہ خط حضرت مسیح موعود نے اپنی وفات سے صرف تین دن پہلے یعنی ۲۳ مئی ۱۹۰۸ء کو لکھا اور آپ کے یوم وصال ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو اخبار عام میں شائع ہوا "

(کلمۃ الفضل ۔ ریویو آف ریلیجنز ص۱۱۰ نمبر ۳ ج ۱۴)

تکمیل نبوت

یعنی مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا زمانہ کم و بیش ۸ سال رہا۔ اس دوران مدعی نبوت کی تمام خصوصیات کی جن کا ذکر انہوں نے مسلمانوں ہونے کی حالت میں کیا تھا تکمیل کو پہنچ گئی۔ یعنی

۱۔ وہ کہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے میرے پر وحی نازل ہوئی ہے۔

۲۔ خلق اللہ کو وہ کلام سناوے جو اس پر خدا کی طرف سے نازل ہوئے۔

۳۔ ایک امت بناوے جو اس کو نبی سمجھتی ہو اور اس کی کتاب کو کتاب اللہ جانتی ہو۔

مرزا صاحب نے اپنے اوپر وحی کے نازل ہونے کا دعویٰ متعدد طریقوں سے کیا ہے مثلاً:

"میرے اس دعوے کی بنیاد حدیث نہیں بلکہ قرآن اور وحی ہے جو میرے پر نازل ہوئی ......"

دوسری بات اس وحی کو سنانے کا فریضہ نبوت تھا۔ چنانچہ محمد یوسف قادیانی فرماتے ہیں:

"حضرت مسیح موعود علیہ السلام (یعنی مرزا غلام احمد قادیانی) اپنی وحی اپنی جماعت کو سنانے پر مامور ہیں۔ جماعت احمدیہ کو اس وحی اللہ پر ایمان لانا اور اس پر عمل کرنا فرض ہے" (النبوۃ فی الاسلام رسالہ احمدی/ ۱۹۱۹ء)

تیسری بات ایک امت کا بنانا، جو اس کو نبی سمجھتی ہو اور اس کی کتاب کو کتاب اللہ جانتی ہو۔ امت کے باب میں مرزا صاحب کہتے ہیں کہ:

"میری امت کے دو حصے ہوں گے ایک وہ جو مسیحیت کا رنگ اختیار کریں گے اور تباہ ہو جائیں گے اور دوسرے وہ جو مہدیت کا رنگ اختیار کریں گے" (مرزا غلام احمد قادیانی الفضل ۲۶ جنوری ۱۹۱۶ء)

اور ان کی کتاب کو کتاب اللہ جاننے کے بارے میں قاضی محمد یوسف قادیانی لکھتے ہیں کہ:۔

"خدا تعالیٰ نے حضرت احمد علیہ السلام کے بحیثیت مجموعی الہامات کو الکتاب فرمایا ہے اور جدا جدا احکامات کو آیات سے موسوم کیا ہے"

(رسالہ النبوۃ فی الاسلام)

مرزا صاحب کا ارشاد ہے کہ:۔

"میں جس طرح پر قرآن شریف کو یقینی اور قطعی طور پر خدا کا کلام جانتا ہوں اسی طرح اس کلام کو بھی جو میرے پر نازل ہوتا ہے، خدا کا کلام یقین کرتا ہوں" (حقیقۃ الوحی صلا۲۱)

الہامات مرزا صاحب اور قرآن

"دوسری کتابیں خواہ کتنی ہی پڑھی جائیں جو سرور اور یقین قرآن شریف سے پیدا ہوتا ہے وہ کسی اور سے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح وہ سرور اور لذت جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الہاموں کو پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے اور کسی کتاب کے پڑھنے سے نہیں ہو سکتی"

(خطبہ محمود احمد خلیفہ قادیان ۱۳ فروری ۱۹۴۸ء)

کلام میں تناقض اور اس کا سبب

"بظاہر مرزا صاحب کا اتفاقی ذہن اس مقام نبوت پر قانع نہ تھا ان کی نظر صفت انبیا کے بلند ترین مقام پر تھی لیکن شاید وہ اپنی سابقہ تحریروں پر نادم تھے وہ یہ بھی کہہ چکے تھے کہ جھوٹے کے کلام میں تناقض ضرور ہوتا ہے" (ضمیمہ براہین احمدیہ ج ۵ صلا۱۱)

اندریں صورت مرزا صاحب کے کلام میں بھی تناقض ضروری تھا بلکہ ان کی نبوت

کے مقام بلند کے اعتبار سے تناقضات کی بھرمار تھی جس سے انکار مشکل تھا۔ ناچار انہوں نے بڑی حوصلہ مندی سے چند تناقضات کا اعتراف فرمایا۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ:۔

"پہلے میں سمجھتا تھا کہ میں نبی نہیں ہوں لیکن خدا تعالیٰ کی وحی نے مجھے اس خیال پر نہ رہنے دیا"

دوسرے تناقض کی تفصیل یہ ہے:

"جب حضور علیہ السلام (یعنی مرزا صاحب) کے ان دو بیانات پر جس میں سے ایک میں آپ نے فرمایا تھا کہ حضرت مسیح پر مجھے جزئی فضیلت ہے اور دوسرے میں فرمایا کہ میں ہر شان میں مسیح علیہ السلام سے بڑھ کر ہوں، تناقض کا اعتراض ہوا تو حضرت نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ:۔

— "اس بات کو توجہ کر کے سمجھ لو کہ یہ اسی قسم کا تناقض ہے کہ جیسے براہین احمدیہ میں مَیں نے یہ لکھا تھا کہ مسیح ابن مریم آسمان سے نازل ہوگا مگر بعد میں یہ لکھا کہ آنے والا مسیح میں ہی ہوں۔ اس تناقض کا بھی یہی سبب تھا۔......"

اس جگہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جس وضاحت سے نبوت کے بارہ میں اپنے عقیدہ کی تبدیلی بیان فرمائی ہے اس کے متعلق کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔ (الفضل ۱۲ جنوری ۱۹۴۰ء)

لیکن اس سے انبیاء کے تناقضات کا فتح الباب ہو گیا کیوں کہ اگر نبوت سے انکار کے بعد نبوت کا دعوے اور ختم نبوت کے متعلق خیالات پر اصرار، حیاتِ مسیح کے عقیدے کی بجائے وفاتِ مسیح کا تصور، مثیلِ موعود ہونے کے دعوے اور مسیح موعود ہونے سے انکار کے بعد مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کرنا

اور پھر ایسی تمام باتوں کو جس کے مرتکب کو بے دین دائرہ اسلام سے خارج قرآن کا مخالف، گستاخ، خیالاتِ رکیکہ کا پیرو وغیرہ خود کہا ہو۔ ان ہی باتوں کا ارتکاب کرنا اگر تناقضات کا فتح الباب نہیں تو اور کیا ہے؟

انبیاء علیہم السلام کی تاریخ سیرت میں کیا کوئی ایک واقعہ بھی ایسا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ ان کی ملہم و مامور من اللہ ہونے کی حیثیت سے انہوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی عقاید کفریہ کا اس طرح اظہار کیا ہو جس طرح مرزا غلام احمد قادیانی بلیس سال تک کرتے رہے۔

دعووں کے ارتقائی مدارج

حقیقت یہ ہے کہ یہ ارتقائی مدارج خود منہاجِ نبوت کے شان کے خلاف ہیں مرزا صاحب سب سے پہلے ایک مبلغ، مصنف، واعظ یا مناظر کی حیثیت میں روشناس ہوئے اس کے بعد انہوں نے محدّث کا روپ دھارا، پھر مجدّد کے مرتبہ پر فائز ہوئے اور نبوت کا دعوےٰ کیا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمسری کے دعوے کے لیے راستہ صاف کیا اور ان کی امت ایمان لے آئی کہ:

"ظلی نبوت نے مسیح موعود (مرزا غلام احمد قادیانی) کے قدم کو پیچھے نہیں ہٹایا بلکہ آگے بڑھایا کہ نبی کریم کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کیا"

(بشیر احمد قادیانی ریویو نمبر ۳ جلد ۱۴)

"مسیح موعود در حقیقت محمد اور عین محمد ہیں اور آپ میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں باعتبار نام، کام اور مقام کوئی دوئی یا مغایرت نہیں" (الفضل یکم جولائی ۱۹۱۶ء)

اور دعوے نبوت کے بعد تمام انبیاء پر فوقیت و افضلیت کا دعوےٰ کیا یہاں تک کہ بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر فوقیت کی طرح ڈالنے کے لیے

یہ عجیب و غریب فارمولا پیش کیا کہ :-

ہر نبی کی دو بعثت ہوتی ہے

"ہر نبی کی دوسری بعثت اس کی پہلی بعثت سے زیادہ شاندار ہوتی ہے۔"

اس کا ثبوت انہوں نے خود اپنی ذات سے اس طرح دیا کہ "پہلا آدم آیا اور اسے شیطان نے جنت سے نکال دیا مگر دوسرا آدم (یعنی مرزا غلام احمد قادیانی) اس لیے آیا ہے تاکہ انسانوں کو دوبارہ جنت میں داخل کرائے۔"

ان آیاتِ کریمہ کی تفسیر مرزا صاحب کی امت نے یوں بیان کی ہے کہ:

"پہلا مسیح آیا اور اسے دشمنوں نے دکھ دیا اور صلیب پر لٹکایا مگر یہ دوسرا مسیح (مرزا غلام احمد قادیانی) اس لیے آیا ہے کہ وہ صلیب کو توڑے .... پہلا نوح آیا اور اس کا بیٹا ہدایت سے محروم رہا مگر یہ دوسرا نوح آیا (یعنی مرزا غلام احمد قادیانی) اس کا بیٹا بھی اگرچہ ایک عرصہ تک ہدایت سے دور رہا مگر خدا نے اسے ہدایت میں داخل کر کے ظاہر کر دیا کہ پہلے نوح کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کا سلوک تھا اس سے بڑھ کر اس کا سلوک دوسرے نوح کے ساتھ ہے۔"

(خطبۂ جمعہ میاں محمود احمد۔ الفضل ۱۱ر جولائی ۱۹۳۱ء ج ۹ نمبر ۵)

یہی وہ معیار تھا جس پر مرزا غلام احمد قادیانی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی فضیلت کی عمارت کھڑی کی اور یہ ایک نیا عقیدہ نکالا گیا کہ مومن کے لیے دوسرے احکامِ الٰہی کی طرح اس بات پر ایمان لانا بھی فرض ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بعثت ہیں۔ چنانچہ

ہلال اور بدر:۔ خطبہ الہامیہ میں حضرت مسیح موعود (مرزا غلام احمد قادیانی)

سے نے آنحضرت کی بعثت اول و ثانی کی باہمی نسبت کو ہلال اور بدر کی نسبت سے تعبیر فرمایا ہے "

یعنی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک ہلال کی سی ہے اور مرزا غلام احمد قادیانی بدر (پورا چاند) ہیں۔

ختم المرسلین کی شان سے بڑھ کر

" اگر مسیح موعود کا منکر کافر نہیں تو نعوذ باللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر بھی کافر نہیں کیوں کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ پہلی بعثت میں آپ کا انکار کفر ہو مگر دوسری بعثت میں جس میں بقول حضرت مسیح موعود (یعنی مرزا غلام احمد قادیانی) آپ کی روحانیت اقویٰ اور اکمل اور اشد ہے اس کا انکار کفر نہ ہو" یعنی مرزا غلام احمد قادیانی سے پہلے حضور کی روحانیت ناقص تھی۔ چنانچہ قاضی محمد ظہور الدین (قادیانی) کی ایمان افروز نظم ملاحظہ ہو:

محمد پھر اتر آئے ہیں ہم میں ۔۔۔ اور آگے سے ہیں بڑھ کر اپنی شاں میں

محمد دیکھنے ہوں جس نے اکمل ۔۔۔ غلام احمد کو دیکھے قادیاں میں

یعنی مرزا صاحب کی شان ختم المرسلین کی شان سے بڑھ کر ہے۔

قادیانی رسالہ فاروق ۱۵۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ہے کہ:۔

" سوچو کہ اگر محمد رسول اللہ پہلی بعثت میں جو نبی اللہ اور رسول اللہ تھے تو دوسری بعثت میں جو شان میں بڑھ کر ہوئی وہی محمد رسول اللہ کیوں نبی اور رسول اللہ نہیں رہا "

یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری بعثت (مرزا غلام احمد قادیانی) کی شان ان سے بہت بڑھ کر ہے لہذا ان کو تو بدرجہ اولیٰ نبی کہنا چاہیئے (انا للہ و انا الیہ راجعون) یہ دعاوی بھی اسی کے شاخسانے ہیں۔

جامع جمیع کمالات

"مسیح موعود (مرزا غلام احمد قادیانی) بھی جامع جمیع کمالات محمدیہ ہے۔ پھر صحابۂ مسیح موعود کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ اور آنحضرتؐ کے صحابہ قرار دیا۔ ان دونوں گروہوں میں تفریق یا ایک کو دوسرے سے مجموعی رنگ میں افضل قرار دینا ٹھیک نہیں ہے۔"

(الفضل ۲۵ مئی ۱۹۱۸ء)

یہ دلیل اس امر کی ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مرزا غلام احمد قادیانی سے افضل نہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کس طرح مرزا صاحب کی جماعت سے افضل ہو سکتے ہیں (درآں حالیکہ)

"آپ میں (یعنی مرزا غلام احمد قادیانی میں) جمیع کمالاتِ محمدیہ کامل طور پر منعکس تھے۔ پس اس لیے آپ کے عین محمد ہونے میں کوئی شک شبہ نہیں۔" (الفضل ۱۶ اگست ۱۹۱۵ء)

یعنی اس عکس میں اور جس کا کہ یہ عکس ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس بنا پر مرزا غلام احمد قادیانی کی بابت قادیانی اصحاب کہتے ہیں کہ:

"وہ وہی فخر الاولین والآخرین ہے جو آج سے تیرہ سو برس پہلے رحمۃ للعالمین بن کر آیا۔" (الفضل ۲۶ ستمبر ۱۹۱۵ء)

"اس کے (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے) لیے (صرف) چاند گرہن کا نشان ظاہر ہوا اور میرے لیے چاند اور سورج دونوں کے گرہن کا اب کیا تو انکار کرے گا؟" (اعجاز احمدی ص۷۱)

استاد اور شاگرد

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معلم ہیں اور مسیح موعود ایک شاگرد۔

شاگرد خواہ استاد کے علوم کا وارث پورے طور پر بھی ہو جائے یا بعض صورتوں میں بڑھ بھی جائے مگر استاد بہر حال استاد ہی رہتا ہے"

(تقریر میاں محمود احمد جماعت مبلغین کے عقائد صحیحہ ص۱)

یہاں پر صرف اشارۃً بتایا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی حضور کے شاگرد ہیں، اور شاگرد استاد سے بڑھا ہوا ہے

زمان البرکات

"اس زمانے کا نام جس میں ہم ہیں زمان البرکات ہے لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ زمان التائیدات و دفع الآفات تھا" (یعنی وہ زمانہ زمان البرکات نہیں تھا)

نزول جبرئیل

جو لوگ نبیوں اور رسولوں پر حضرت جبریل علیہ السلام کا وحی لانا ضروری شرط نبوت قرار دیتے ہیں ان کے جواب میں بتایا گیا ہے کہ:۔

"حضرت مرزا صاحب کے پاس نہ صرف ایک بار جبریل آیا بلکہ بار بار رجوع کرتا تھا"

چنانچہ خود مرزا غلام احمد قادیانی کا ارشاد ہے کہ:۔

"میرے پاس آئیل آیا اور اس جگہ آئیل خدا تعالیٰ نے جبریل کا نام رکھا ہے" (حقیقۃ الوحی ص۱۰۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بروزی نبی تھے

پھر جو لوگ اس شبہ میں تھے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے آپ کو بروزی نبی کہا ہے جس سے حقیقی معنوں میں نبی مراد نہیں ہو سکتا۔ اس کی تحقیق تحفہ گولڑویہ ص۹۶ میں دیکھیے جس میں بتایا گیا ہے کہ:۔

"حضرت مسیح موعود (مرزا غلام احمد قادیانی) نے آنحضرت کو بھی بروزی نبی قرار دیا ہے چنانچہ فرمایا کہ مکمل ہدایات کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بروزوں میں ظہور فرمایا تھا۔ ایک بروزِ موسوی دوسرا بروزِ علیسوی"۔ (تحفہ گولڑویہ ص۹۶)

بظاہر بعض قادیانی حضرات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بروز ہونا بھی گوارا نہ تھا چنانچہ الفضل ۲۰، اکتوبر ۱۹۳۱ء میں بتایا گیا ہے کہ:۔

حضور بروزی نبی نہ تھے بلکہ مثیل تھے۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مثیل تھے مگر بروز نہ تھے کیوں کہ خدا نے آپ کا نام موسیٰ نہیں رکھا لیکن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام (یعنی مرزا غلام احمد قادیانی) کو تمام انبیاء کے نام دیئے گئے اور آپ ان کے بروز ہو کر نبوت کے مقام پر پہنچے۔ پس فنا فی الرسول اور مثیل ہونا بروز سے علیحدہ چیزیں ہیں البتہ بروز اور اوتار ہم معنے ہیں"۔

مرزا صاحب خاتم الانبیاء۔

ان کا اعتراف ہے کہ:۔

"میں بار بار بتا چکا ہوں کہ میں .... بروزی طور پر وہی خاتم الانبیاء ہوں"۔ (ایک غلطی کا ازالہ)

بدقسمتی سے مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی تحریروں میں خود کو امتی کہہ دیا تھا لیکن چونکہ بعد کی تحریروں میں انہوں نے مقام اشرف الانبیاء پر قدم رکھا اس لیے ان کے امتیوں کو یہ بھی کہنا پڑا کہ:۔

مرزا صاحب کو امتی کہنا کفر ہے: "مسیح موعود کو احمد نبی اللہ تسلیم

نہ کرنا اور آپ کو امتی قرار دینا، امتی گروہ سمجھنا گویا آنحضرت کو جو سید المرسلین اور خاتم النبیین ہیں امتی قرار دینا اور امتیوں میں داخل کرنا ہے جو کفرِ عظیم اور کفر در کفر ہے۔" (الفضل ۲۹ جنوری ۱۹۱۵ء)

یعنی مرزا غلام احمد قادیانی امتی نہیں ہیں بلکہ انہیں امتی کہنا کفر ہے۔

تمام انبیاء مجدد تھے

بعض نادان کہتے ہیں کہ وہ تو ایک مجددوں میں سے ایک مجدد تھے۔ خدا کے نبی کیوں کر ہو سکتے ہیں: اس کا جواب قادیانیوں نے یہ دیا ہے کہ:

"تمام انبیاء مجدد ہی ہوتے ہیں چنانچہ افضل الرسل محمد رسول اللہ کو بھی ہمارے امام (یعنی مرزا غلام احمد قادیانی) نے مجدد ہی لکھا ہے:"

(لیکچر سیالکوٹ ۲۹ جنوری ۱۹۱۱ء)

تشریعی نبوت

مرزا غلام احمد قادیانی نے ابتداءً صاحبِ شریعت نبی ہونے سے انکار کیا تھا شاید اس پر افسوس ہوا۔ لہذا تشریعی نبوت کی بنا اس طرح ڈالی:

"یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے۔ جس نے اپنی وحی کے ذریعے سے چند امر و نہی بیان کیے اور اپنی امت کے لیے ایک قانون مقرر کیا وہی صاحبِ شریعت ہو گیا۔ میری وحی میں امر بھی ہے اور نہی بھی..... اگر کہو کہ شریعت سے وہ شریعت مراد ہے جس میں نئے احکام ہوں تو یہ باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی صُحُفِ اِبْرَاهِیْمَ وَ مُوْسٰی یعنی تعلیم قرآنی توریت میں بھی موجود ہے"

(اربعین نمبر ۴ صفحہ ۶)

یعنی جس طرح قرآنی تعلیم توریت میں ہے اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی کی تعلیم

قرآن میں ہے۔ پس جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صاحب شریعت نبی تھے۔ اسی طرح مرزا صاحب بھی صاحب شریعت نبی ہیں۔

پھر اسی رسالہ کے ص۱۵ پر یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ جس طرح شرائع سابقہ میں شریعت اسلامیہ نے اصلاح کی اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی شریعتِ اسلامیہ میں ترمیم کی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ:۔

دینی جہاد حرام ہے

"جہاد یعنی دینی لڑائیوں کی شدت کو خدا تعالیٰ آہستہ آہستہ کم کرتا گیا۔ حضرت موسےٰ کے وقت میں اس قدر شدت تھی کہ ایمان لانا بھی قتل سے بچا نہیں سکتا تھا۔ شیر خوار بچے بھی قتل کیے جاتے تھے۔ پھر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں کا قتل حرام کیا گیا اور پھر بعض قوموں کے لیے بجائے ایمان کے صرف جزیہ دے کر مواخذہ سے نجات پانا قبول کیا گیا اور پھر مسیح موعود کے وقت قطعاً جہاد کا حکم موقوف کر دیا گیا۔" (اربعین نمبر۴ ص۱۵)

قطع نظر اس کے کہ اس بیان میں اگر شرارت نہیں تو حماقت ضرور ہے کہ فرعونی احکام کو دینی لڑائی اور عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے برابر رکھا گیا ہے اس میں وضاحت سے قرآن حکیم کے حکم جہاد کے خاتمہ کا اعتراف کیا گیا ہے۔ چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اعلان کیا کہ:۔

"آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا........

میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں
اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال

دین کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آگیا مسیح جو دین کا امام ہے
دین کی تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد
منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد " (تبلیغ رسالت ص۴۹)

"ہمارے امام (مرزا غلام احمد قادیانی) نے ایک بڑا حصہ عمر کا جو ۲۴ برس ہیں اس تعلیم میں گزارا ہے کہ جہاد حرام اور قطعاً حرام ہے"

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۱ - نمبر ۳)

"یہ مبارک فرقہ نہ ظاہری طور پر نہ پوشیدہ طور پر جہاد کی تعلیم کو ہرگز جائز نہیں سمجھتا" (ارشاد مرزا غلام احمد قادیانی مندرجہ تبلیغ رسالت)

اب کوئی قرآن نہیں

مطلب یہ ہے کہ ایک نئی شریعت کی بنیاد پڑ گئی۔ چنانچہ مرزا صاحب کے خلیفہ محمود احمد کا ارشاد ہے:۔

"اب کوئی قرآن نہیں سوائے اس قرآن کے جو حضرت مسیح موعود (مرزا غلام احمد قادیانی) نے پیش کیا......"

(الفضل ۱۵ر جولائی ۱۹۲۴ء)

یہی وجہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی تالیفات میں متعدد آیات قرآن کے الفاظ میں الٹ پلٹ و اضافہ یا رد و بدل کر دیا گیا ہے اور واضح غلطی کے باوجود ان کی اصلاح نہیں کی گئی حالانکہ ان کی کتابوں کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ قادیانیوں کا خیال ہے کہ:۔

"مرزا صاحب نے جس طرح آیت کو لکھا وہ صحیح ہے اور قرآن میں جو

کچھ ہے وہ غلط ہے۔
اور حدیث کے باب میں بھی ان کا کہنا یہی ہے کہ:۔

"جو ان کے کہنے کے مطابق ہے وہ حدیث صحیح ہے"

باقی کے باب میں ان کا کہنا ہے کہ:۔

"دوسری حدیثوں کو ہم ردی کی طرح پھینک دیتے ہیں" (اعجاز احمدی ص۲)

معاندانہ روش

ظاہر ہے کہ ملتِ اسلامیہ اس دریدہ دہنی میں مرزا غلام احمد قادیانی کی ہمنوا نہ ہوسکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا مزاج مسلمانوں سے برہم ہوا اور معاندانہ روش پر اسی طرح چل پڑے جو بالعموم مدعیانِ نبوت کا شیوہ یا اسلام سے پھر جانے والے مرتدوں کا کردار ہے۔ چنانچہ امت مرزائیہ نے یہ اعلان کر دیا کہ:۔

"ہمارا اور ان (دوسرے تمام مسلمانوں) کا اختلاف فروعی نہیں، اصولی ہے" (الفضل ۲۱ جولائی ۱۹۲۳ء)

اور آئینہ صداقت ص۳۵ پر یہ فتوے شائع ہوا کہ:۔

"کل جو مسلمان حضرت مسیح موعود کی امت میں داخل نہیں ہوئے خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں"

چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب کا ارشاد ہے کہ:۔

"ہم ان (غیر احمدی اشخاص) کو کافر کہتے ہیں" (الفضل ۱۴ ستمبر ۱۹۲۳ء)

پھر اس برہمی مزاج کی شدت ملاحظہ ہو:۔

"سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلاۃ والسلام (مرزا غلام احمد

قادیانی) نے صاف اور صریح الفاظ میں لکھا ہے کہ آپ کو خدا نے بتایا ہے کہ احمدیوں پر حرام اور قطعی حرام ہے کہ کسی مکفر و مکذب اور متردد کے پیچھے نماز پڑھیں "۔ (انوارِ خلافت صفحہ ۸۹)

"بہت سے غیر احمدی لوگ ہمارے پیچھے نماز پڑھ لیتے ہیں۔ احمدی ہرگز غیر احمدی کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے "۔
(میاں محمود احمد صاحب بیان اجلاس سب جج گورداسپور الفضل جون ۱۹۲۲ء)

"تمہارا فرض ہے کہ جب غیر شخص کو واقف کرو پھر اگر تصدیق نہ کرے تو وہ بھی منافق ہے۔ اس کے پیچھے نماز نہ پڑھو"
(ارشادِ مرزا غلام احمد قادیانی۔ ملفوظات احمدیہ صفحہ ۹)

"بیس دن کے قریب جو ہم وہاں (مکہ معظمہ) مقیم رہے یا گھر پر نماز پڑھتے رہے یا مسجدِ کعبہ میں الگ اپنی جماعت کرا کے "
آئینہ صداقت صفحہ ۹۱

"حضرت مرزا صاحب نے اپنے بیٹے (افضل احمد) مرحوم کا جنازہ محض اس لیے نہیں پڑھا کہ وہ غیر احمدی تھا" (الفضل ۱۵ دسمبر ۱۹۳۱ء)

دعائے مغفرت

"غیر احمدیوں کا کفر بینات سے ثابت ہے اور کفار کے لیے دعائے مغفرت جائز نہیں " (فتوئے الفضل ۷ فروری ۱۹۲۱ء)

"جو شخص حضرت مرزا صاحب کا انکار کرتا ہے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ اس کے لیے دعائے استغفار جائز نہیں!"
(الفضل ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۱ء)

"جس طرح عیسائی بچہ کا جنازہ نہیں پڑھایا جاسکتا۔ اگرچہ وہ

معصوم ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک غیر احمدی بچے کا بھی جنازہ نہیں پڑھایا جا سکتا۔" (الفضل ۲۳ اکتوبر ۱۹۲۳ء)

"ایسا شخص جو حضرت مرزا صاحب کو تو سچا مانتا ہے لیکن ابھی اس نے بیعت نہیں کی اور احمدیت کے متعلق غور کر رہا ہے اور ایسی حالت میں مر گیا ہے .... ہمیں اس کے متعلق بھی یہی کرنا چاہیئے کہ اس کی نماز جنازہ نہ پڑھیں۔" (انوار خلافت ص ۹۳)

"حضرت مسیح موعود نے اس احمدی پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے جو اپنی لڑکی غیر احمدی کو دے۔" (برکات خلافت ص ۵)

باقی کیا رہ گیا

"غیر احمدی سے ہماری نمازیں الگ کی گئیں۔ ان کو لڑکیاں دینا حرام قرار دیا گیا۔ ان کے جنازے پڑھنے سے روکا گیا۔ اب باقی کیا رہ گیا جو ہم ان کے ساتھ مل کر کر سکتے ہیں؟ ایسا کوئی تعلق نہیں جو اسلام نے مسلمانوں کے ساتھ خاص کیا ہو اور پھر ہم کو اس سے نہ روکا گیا ہو۔" (صاحبزادہ بشیر احمد قادیانی۔ ریویو آف ریلیجنز نمبر ۴ ج ۱۴ ص ۱۶۹)

بالآخر مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کی امت کی سب سے بڑی معصیت انبیاء علیہم السلام کی توہین اور جناب مسیح اور مریم صدیقہ علیہما السلام کی شان میں دشنام طرازی ہے جس کا نقل کرنا بھی شرافت سے بعید ہے۔ اس بے باکی کے لیے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی جرأت دیکھیے:

آنحضرتؐ کی ہتک

"کہا جاتا ہے کہ احمد نام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور آپ کے سوا کسی اور شخص کو احمد کہنا آپ کی ہتک ہے لیکن ....

میں ایمان رکھتا ہوں کہ احمد کا لفظ جو قرآن میں آیا ہے وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق ہی ہے۔"

(انوارِ خلافت ص۲۱ میاں محمود احمد)

"قرآنی وحی میں کسی مقام سے آپ کا نام نامی احمد ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں محمد آپ کا اسم گرامی ضرور ہے .... اور آنے والا احمد رسول جس کا ذکر مسیح کی پیشین گوئی میں ہے (یعنی قرآن میں نہیں ہے) وہ آپ (مرزا غلام احمد قادیانی) ہیں۔" (الفضل ۱۹ر اگست ۱۹۱۵ء)

"کس طرح تسلیم کر لیا جائے کہ آپ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام احمد تھا۔ ہاں احمدیت کی صفات آپ میں ضرور پائی جاتی ہیں.... نام کے لحاظ سے اس کے مصداق حضرت مرزا صاحب ہیں۔"

(الفضل ۱۸ر اپریل ۱۹۱۶ء)

توہین کا یہ سلسلہ بہت طویل ہے اور مرزا غلام احمد قادیانی نے توہین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بنیاد رکھی اس پر ان کے افراد امت نے بہت بڑی عمارت کھڑی کر لی ہے حتیٰ کہ ان سب کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ قادیانی جماعت امت مسلمہ سے بالکل علیحدہ ایک اور مذہب و ملت کی حامی ہے چنانچہ بعد میں کھلم کھلا کہا جانے لگا کہ:۔

ایک ایک چیز میں اختلاف

"آپ (مرزا غلام احمد قادیانی) نے فرمایا کہ یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفات مسیح یا اور چند مسائل میں ہے آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی ذات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، غرض کہ آپ نے بتایا کہ ایک ایک چیز میں

ہمیں ان سے اختلاف ہے۔" (الفضل ۳۰ جولائی ۱۹۳۱ء)

"خلیفۂ اول نے اعلان کیا تھا کہ ان کا (مسلمانوں کا) اسلام اور ہمارا (قادیانیوں کا) اسلام اور ہے۔" (الفضل ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء)

مرزا غلام احمد قادیانی کے خلیفہ اول کا یہ اعلان اصولی طور پر درست اور قابلِ تسلیم ہے۔ بلاشبہ مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کی امت جس اسلام پر قائم ہے وہ اس اسلام سے بالکل مختلف ہے جس کی بابت قرآن حکیم نے قطعی فیصلہ فرمایا ہے کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ اور جس کے متعلق خود پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"نہ میرے بعد کوئی نبی ہے اور نہ کوئی امت ہے۔ میں آخری نبی ہوں اور یہ امت مسلمہ آخری امت ہے۔ اس کے خلاف جو مسلمان زبان کھولتا ہے وہ دینِ اسلام سے خارج ہے اور دین سے برگشتہ (یا مرتد) ہے اور ہر وہ شخص جو اپنے دین سے برگشتہ ہو جائے وہ انتہائی تعزیر کا مستوجب ہے۔"

چنانچہ آپؐ نے ہر مدعیِ نبوت اور اس کے پیروؤں کو قتل کا حکم دیا۔ کچھ مدعیانِ نبوت عہدِ نبوی میں قتل ہوئے اور جو باقی رہا وہ وصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اول وہلہ میں قتل کر دیا گیا اور اس کے بعد جہاں کہیں کسی مدعیِ نبوت کا سراغ ملا حکومتِ اسلامی نے اس کا اور اس کے پیروؤں کا خاتمہ کر دیا۔ کیونکہ مدعیانِ نبوت اور ان کے پیروؤں نے ملتِ اسلامیہ کو جس قدر نقصان پہنچایا، کافروں اور غیر مسلموں نے نہیں پہنچایا۔

امن پسند مرتد

جرمِ ارتداد یوں تو فی الجملہ مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے لیکن مدعیانِ نبوت اور ان کی جماعت کا ارتداد انتہائی تباہ کن اور ملتِ اسلامیہ سے بدترین عداوت کے مترادف

ہے۔ کیونکہ یہ ایک لحاظ سے اجتماعی ارتداد ہے۔ فاضل مصنف جناب جسٹس رحمٰن صاحب نے اپنی کتاب میں جا بجا امن پسند مرتدوں کا ذکر فرمایا ہے لیکن انہوں نے کسی ایک امن پسند مرتد کی نشاندہی نہیں فرمائی۔

• جبری اصلاح

حقیقت یہ ہے کہ ارتداد بجائے خود فتنہ و فساد اور اختلاف و شقاق و عداوت و بدخواہیِ مسلماناں کا ایک دروازہ کھول دیتا ہے اور یہ جو ہم اپنے گرد و پیش بہت سے تارکانِ مذہبِ اسلام اور یا جدید مدعیِ نبوت اور ان کے پیروؤں کو چلتا پھرتا بظاہر امن پسند دیکھتے ہیں اور جن سے ہمارے مجلسی اور معاشرتی روابط بھی ہیں اس کا سبب یہ نہیں کہ ان کے دلوں میں ہماری طرف سے نفرت و حقارت بلکہ مخالفت و عداوت کا جذبہ موجزن نہیں ہے اور وہ صدقِ دل سے اسلامی اخوت اور رواداری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر ان کو حکومت و اقتدار حاصل ہوتا تو وہ کسی غیر قادیانی کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی قلمرو میں زندہ رہنے کا حق نہ دیتے۔ جو کچھ ایک قادیانی دل سے چاہتا ہے اس کا اندازہ میاں محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان کی اس تقریر سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے آج سے ۴۷ سال پیشتر کی تھی کہ:

"حکومت ہمارے پاس نہیں کہ ہم جبر کے ساتھ ان لوگوں کی اصلاح کریں اور ہٹلر مسولینی کی طرح جو شخص ہماری حکومت کی تعمیل نہ کرے اسے ملک سے نکال دیں اور جو ہماری باتیں سنے اور ان پر عمل کرنے پر تیار نہ ہو اسے عبرتناک سزا دیں۔ اگر حکومت ہمارے پاس ہوتی تو ہم ایک دن کے اندر اندر یہ کام کر لیتے۔"

(الفضل قادیان جلد ۲۲ نمبر ۲۷۹ مورخہ ۲ جون ۱۹۳۶ء)

لیکن انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ اگر وہ لوگ جن کے پاس حکومت ہے یا آ جائے تو ان کو بھی جبر کے ساتھ ان کی اور ان کی جماعت کی اصلاح کرنے کا حق ہے اور جو شخص آئینِ حکومت کی تائید نہ کرے اسے ملک سے نکال دیں اور جو حکومت کی باتیں سننے اور ان پر عمل کرنے پر تیار نہ ہو اسے وہی عبرتناک سزا دیں جس کا حکم دین سے برگشتہ ہونے والوں کے لیے پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے۔ اگر ایسی حکومت ہوتی تو وہ ایک دن کے اندر اندر یہ کام کر لیتی (جیسا کہ حکومتِ ایران نے بابی اور بہائی فرقہ کے ساتھ کیا)۔ ——— فاعتبروا یا اولی الابصار

طبع اوّل

نام کتاب ---------- جرمِ ارتداد اور اس کی اسلامی سزا

تالیف ---------- منظور احسن عباسی

ناشر ---------- اسلامی مشن سنت نگر لاہور

مطبع ---------- آکسفورڈ اینڈ کیمبرج پریس لاہور

تاریخ اشاعت ---------- اوائل سال ۱۹۷۴ء

تعداد ---------- ایک ہزار

قیمت ----------

کتابت ---------- خبیب احمد سلیم لاہور

نوٹ

ہمارے ہاں اصلی انجیل برنباس سے اردو ترجمہ کی چند جلدیں موجود ہیں۔ ان میں سے لاطینی زبان کی انجیل کا ایک صفحہ بذریعہ فوٹو سٹیٹ اتار کر لگا دیا گیا ہے صفحات ۳۶۹

قیمت مجلد ۱۲ روپے

اسلامی مشن سنت نگر لاہور

مقاصد

۱۔ مسلمانوں میں اسلامی تصورات کو ترویج دینا۔

۲۔ غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کرنا۔

۳۔ قرآنی تعلیم کا عام کرنا۔

ذرائع

۱۔ غیر مسلموں کے اعتراضات کے جوابات میں رسائل شائع کرنا۔

۲۔ دینِ اسلام پر رسالے اور کتابیں شائع کرکے مسلمانوں کو حقائق اسلام سے واقف کرنا۔

۳۔ غیر مسلموں میں بالخصوص عیسائیوں میں بذریعہ خط وکتابت اسلام کی نشرواشاعت کرنا۔

لائحہ عمل

اسلامی مشن ایک غیر سیاسی ادارہ ہے اس کا مقصد وحید اپنے مقاصد کی تکمیل ہے اس سلسلے میں ضروری کتب اور رسائل کی اشاعت اور دینِ اسلام کی تبلیغ کے لیے مبلغوں کا تعین کرنا۔ نو مسلموں کی بہبود و فلاح کے لیے کوشش کرنا اور ان کی مشکلات اور مسائل کا مداوا کرنا بھی ایک اہم ذمہ داری ہوگی۔

رکنیت: ہر مسلمان اس کا ممبر ہو سکتا ہے۔ اور ممبران کی تین اقسام ہیں:۔

۱۔ وہ جو بارہ روپے سالانہ چندہ ادا کریں گے۔

۲۔ وہ حضرات جو پچاس روپے یا اس سے زائد رقم بطور عطیہ ادا کریں۔

۳۔ جو حضرات یکصد روپیہ یا اس سے زائد رقم یکشت عطیہ دیں گے وہ تاحیات ممبر ہوں گے۔

کنوینر — اسلامی مشن سنت نگر لاہور